نسیمِ مغرب

(چھبّیس مُنتخب انگریزی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ)

امیر چند بہارؔ

انجمن ترقّی اردو (ہند) علی گڑھ

(جملہ حقوق محفوظ)

سن اشاعت ۱۹۶۳ء
تعداد ایک ہزار
قیمت ...یے

A.T.U. (HIND)
REVISED PRICE Rs. 10.00

مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی

فہرست

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سُخنوری

(اقبالؔ)

انتساب

نازشِ علم و محافظِ ادب

پروفیسر ہمایوں کبیر کے نام

جنھیں بے شمار انگریزی نظمیں اب تک زبانی یاد ہیں

پیش لفظ

نسیمِ مغرب کی نظمیں میری نظر سے گزر چکی ہیں اور میں نے بعض کا مقابلہ ORIGINAL انگریزی نظموں سے بھی کیا ہے۔ پروفیسر بہارؔ کی کوشش کامیاب اور قابلِ ستائش ہے۔ بہار صاحب اردو میں شعر کہتے ہیں اور انگریزی ادب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انگریزی نظم کا اُردو میں منظوم ترجمہ کرنے کے لیے یہی دو وصف درکار ہیں اور پروفیسر بہارؔ اِن دونوں سے بخوبی بہرہ ور ہیں۔

پروفیسر بہارؔ نے چھبیس شہرۂ آفاق انگریزی نظموں کو اردو شعر کا لباس دے کر دونوں زبانوں کی بڑی بھاری خدمت سرانجام دی ہے۔ ترجموں میں اصل کا حُسن اُسی آب وتاب سے جھلک رہا ہے بلکہ کئی جگہوں پر مترجم کی طرف سے اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ان ترجموں کی افادیت مسلّم ہے۔ یہ نظمیں یقیناً عام قارئین کے لیے اور بالخصوص ادب کے طلبا کے لیے انگریزی نظموں کی سپرٹ سمجھنے کے علاوہ ان میں ادبی رُجحان پیدا کرنے میں مُمد ثابت ہوں گی۔

تلوک چند محروم

۸/۶۰ موتی باغ۔ نئی دہلی
۲۴ اپریل ۱۹۶۱ء

دُعائیہ

"نسیم مغرب" اُن ۲۶ گراں قدر انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ ہے جو عزیزی پروفیسر بہار ایم - اے کی محنتِ شاقّہ کا نتیجہ ہے ۔ ایک زبان سے دُوسری زبان میں کامیاب ترجمہ کرنا نثر میں بہت دُشوار ہوتا ہے چہ جائے کہ اُسے اچھی نظم میں ترجمہ کیا جائے ، اس مشکل کی وضاحت کے لیے فارسی کے اس لطیفے کو دیکھئے :-

ظریفے بہ عیادتِ مریضے رفت ۔ پرسید کہ چہ حال است ۔ گفت تپ لرزہ دارم و دردِ کمر ۔ تپ شکستہ ۔ امّا دردِ کمر باقی است ۔ گفت ۔ انشاءاللہ ایں ہم مے شکند ۔

اب آخری جُملہ کا اُردو ترجمہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درد مذکر ہے مگر فارسی میں مے شکند مذکّر اور مونّث دونوں کے لیے مشترک آتا ہے ۔ مذکور تو ظریف نے درد کا کیا ہے مگر نکتہ کمر سے تعلق رکھتا ہے ۔ مگر یہ کہیں کہ یہ بھی ٹُوٹ جائے گا تو اصل نُکتہ برقرار نہیں رہتا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ بھی ٹوٹ جائے گی تو مقصودِ بیان مختلف ہو جاتا ہے ۔

اِسی قسم کی سینکڑوں مشکلات زبان اور حُسنِ بیان کے رستے میں حائل ہوتی ہیں ۔ یہ مثال تو صرف نثر سے تعلّق رکھتی ہے ۔ نظم میں استعاروں اور کنایوں کی بھرما اور بھی دُشواریاں پیدا کرتی ہے ۔ بعض وقت ایک محاورے کا بدل دوسری زبان میں نہیں ملتا ۔ ان مشکلات کا وہی شخص اچھی طرح قیاس کر سکتا ہے جسے کبھی نظم کا ترجمہ نظم میں کرنے کا اتفاق ہُوا ہو ۔

بہار صاحب نے اس دشوار گزار منزل کو طے کرنے میں مقدور بھر کوشش

کی ہے۔ جن نظموں کو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے وہ نامور مشاہیر کی بہترین اور چیدہ نظمیں تھیں۔ ایسی نظموں کا منظوم ترجمہ جو مشاہیر نے پورا زورِ طبیعت صرف کر کے کہی ہیں اور بھی دشوار ہے۔ اس لیے ناظرین اور خاص کر دونوں زبانوں کے فاضل اصحاب کو لازم ہے کہ ان مشکلات کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد مترجم کی کاوشِ فکر اور محنت شاقہ پر غور فرمائیں۔ مضامین کے لحاظ سے بھی یہ نظمیں بہت پاکیزہ بہت سبق آموز اور بہت افادی حیثیت کی ہیں۔ دُعا ہے کہ دُنیائے ادب میں یہ مجموعہ مقبول اور موجبِ تحسین ہو۔

نکودر
۱۲ر فروری ۱۹۶۱ء

جوش ملسیانی

کچھ مترجم کی طرف سے

اِکا دُکا انگریزی نظموں کے منظوم اُردو ترجمے اس سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آتے رہے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انگریزی شاعری کے بہترین جواہر پاروں کو تاریخی تدریج ملحوظ رکھتے ہوئے اُردو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی سنجیدہ اور با اصول کوشش نہیں کی گئی۔ تاہم میں انگریزی نظموں کو اردو نظم کا جامہ پہنانے والا پہلا شخص ہونے کا مدعی نہیں ہوں۔ نہ اُردو زبان میں مجھے وہ ملکہ حاصل ہے جو کسی علومِ مشرقی کے پروفیسر یا اہلِ زبان کو ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ میری عُمر کا بیش تر حصہ انگریزی زبان اور ادب کے پڑھنے پڑھانے ہی میں صَرف ہوا ہے۔ بایں ہمہ عین ممکن ہے کہ اہلِ نظر نکتہ شناس میرے ترجموں کو پڑھ کر مجھے اِس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کرنے کے لیے حق بجانب قرار دیں۔

ایک زبان کے ادب کو کسی دُوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اصل کے حُسن کو دو بالا کر دینا تو بہت بڑا وصف ہے۔ لیکن اصل کے حُسن کو برقرار رکھنا اچھے ترجمہ کے لیے کم سے کم شرط ہے۔ اور اگر مترجم کے ہاتھوں اصل کی سپرٹ ہی مفقود ہو جائے تو نقشِ ثانی کتنا ہی دلآویز کیوں نہ ہو وہ ترجمہ نہیں کہلائے گا بلکہ کچھ اور ہی چیز بن جائے گی۔

گزشتہ چند سالوں میں مجھے کچھ انگریزی نظموں کے اُردو ترجمے دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ اور ان میں سے خاص طور پر ایک نظم کا ترجمہ تو کافی مشہور و مقبول ہو چکا ہے۔ لیکن مجھے اس مقبولِ عام ترجمے کو پڑھ کر کچھ مایوسی ہوئی۔ خدا شاہد ہے کہ اگر مجھے ایسی مایوسی

اور ذہنی کوفت نہ ہوتی تو میں اس شہرۂ آفاق نظم اور دُوسری چیدہ نظموں کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت اِس شدّت کے ساتھ محسوس نہ کرتا۔ بطور شاعری تو یہ نظمیں خوب تھیں مگر انگریزی شاعری کے طالبِ علم یا معلّم کے زاویۂ نگاہ سے مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ اصل نظم میں شاعر کا مفہوم کچھ اور ہی تھا۔ فٹز جیرلڈ کے قطعات کی دلآویزی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فٹز جیرلڈ نے عمر خیاّم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اور اصل رُباعیوں کا مفہوم برقرار نہ رہنے کے باعث نقّادوں نے اس کی کاوشِ فکر کو ترجمہ کہنے سے انکار کیا ہے۔ یہی حال ہومر کے ترجمہ کا ہے جو انگریزی شاعر پوپ نے کیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک زبان سے دُوسری زبان میں محض خیال کو ادا کر دینا (PARAPHRASE کر دینا) بھی ادبی معنوں میں ترجمہ نہیں کہلاتا۔ جب تک کہ اصل نظم کی باریکیوں اور گہرائیوں سے پُوری واقفیت نہ ہو ترجمے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ یہ خوبی اُسی صورت میں ممکن ہے جب مترجم کو اصل نظم کی زبان پر بھی پُورا عبُور حاصل ہو۔ کیونکہ سطحی معنوں کو دوسری زبان میں منتقل کر دینا تو چنداں مشکل نہیں لیکن اگر ترجمے میں اصل خیال کی لطافتیں اور نزاکتیں باقی نہ رہیں تو یہ اصل نظم کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔[1]

میرے ترجموں میں فنّی باریکیوں کا کھوج اور رموز و نکات کی چھان بین تو دونوں زبانوں کے ماہر نکتہ دانوں کا کام ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے نظموں کے حُسن کو دوبالا کرنے کی کوشش میں اصل کا قلع قمع نہیں کیا اور جہاں تک ہوسکا میں نے محنت اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔ محنت سے کام لینے کا یہ مطلب نہیں کہ اصل نظم کو سامنے رکھ کر میں سطراً سطراً اسے اُردو نظم کے سانچے میں ڈھالتا گیا اور

---

[1] اردو شعراء میں سے جنابِ محروم اور جناب منوّر لکھنوی نے اس میدان میں قابلِ رشک کام کیا ہے — بہار

دیانت داری سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ مَیں نے انگریزی نظموں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا ہے۔ لفظی ترجمہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ مترجم کی تخلیقی قوّت کے فقدان کی دلیل بھی۔ کامیاب اور پُر تاثیر ترجمہ کرنے کے لیے اصل نظم کی سپرٹ کو بھی اپنے اندر جذب کر لینا مترجم کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دونوں زبانوں پر قدرت ہونا۔ اصل نظم کی سپرٹ کو اپنی رُوح کا جزو بنائے بغیر منظوم ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس میں تاثر مفقود ہوگا۔ گزشتہ بارہ تیرہ برس سے مختلف تعلیمی درسگاہوں میں انگریزی شاعری پر لیکچر دینے اور انگریزی نظمیں طلبا کو پڑھانے کے بعد مَیں نہ صرف ان کی باریکیوں سے آشنا ہو گیا بلکہ ان کا بیشتر حصہ مجھے ازبر ہو گیا پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے بہت سی نظموں کے ترجموں کے ساتھ میری زندگی کی کوئی داستان وابستہ ہے۔ ہر حسّاس فن کار کی طرح مجھے بھی جادۂ حیات پر گوناگوں ذہنی اُلجھنوں سے گزرنا پڑا۔ کئی بار زمانے کے سرد و گرم سے بیزار ہو کر مَیں نے اپنے آپ کو اُسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار پایا جس میں مُبتلا ہو کر ہیملٹ کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ "مرنا اچھا ہے یا جینا"۔ یا جب جان کیٹس زندگی کی ہولناک تلخیوں کی تاب نہ لا کر درخت پر زمزمہ خواں بُلبُل کی صحبت میں فرار ڈھونڈتا اور کھو جاتا ہے۔ یا اپنے جان سے عزیز ارمانوں کا خون ہوتا ہوا دیکھ کر "آخری سانٹ" کے ذریعے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ "بے رحم حسینہ"۔ "نغمۂ شبینہ"۔ "عالمِ یاس میں"۔ "پچیسویں سالگرہ پر"۔ "کسی کی یاد" کئی نظمیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں اُسی طرح میری اپنی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی کرتی ہیں جس طرح کہ ان نظموں کے مصنّفین انگریزی شعرا کی۔ جب کسی غم خوار نے میری آزردگی کا سبب پُوچھا تو مَیں نے جواب میں عین وہی بات کہنے کی ضرورت محسوس کی جو آرنلڈ نے تقریباً ایک سو سال پہلے کہی تھی ؎

جہاں میں پہلا سا حُسنِ یقیں نہیں ملتا   وہ ذوقِ دید وہ جذبہ کہیں نہیں ملتا

ہ انجمن کے فاضل مبصّر کے ایماء پر یہ ترجمہ موجودہ انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بہار

کسی کے دل میں محبت نہیں کسی کے لیے
کہیں چراغ نہیں جلتے روشنی کے لیے
کسی بشر کو کسی پر بھی اعتبار نہیں
کوئی کسی کا حقیقت میں غم گسار نہیں
سمجھ تو کم ہے مگر اس طرح جھگڑتے ہیں
اندھیری رات میں جیسے سپاہی لڑتے ہیں

("فریب نظر" سے)

مَیں نے ٹینی سن کی نظم "ڈوِر بیچ" کا ترجمہ اُن ایام میں کیا جب مَیں اِس نظم کے کرداروں کی طرح خود بھی "گردشِ پیہم کا مزا دیکھ چکا تھا" اور دنیا میں ہر قسم کی تگ و دو بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ اسی طرح نظم "یولیسز" پوری طرح سے میرے ہی ہنگامی حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ الغرض جب کبھی مَیں نے اپنے آپ کو اس قسم کی ذہنی اُلجھن میں پایا جس کے تحت جان کیٹس، ملٹن، شیلے یا ٹینی سن نے مندرجہ بالا منظومات اور اس طرح کی دُوسری چیزیں کہی تھیں مَیں نے محسوس کیا کہ اپنی اندرونی کیفیت کا ان انگریزی شعراء سے زیادہ موثر انداز میں اظہار کرنا ممکن نہیں۔ آخر میں اس وجدانی کیفیت میں ان جلیل المرتبہ انگریزی شعراء کے شہ پاروں کو اپنی محبوب اُردو زبان میں شعر کا لباس دینے پر مجبور ہو گیا۔ اور ایک نظم یا بند کا ترجمہ کر چکنے کے بعد مجھے ویسی ہی ذہنی تسکین یا قلبی مسرت حاصل ہوئی جیسی کہ اپنے دل کے جذبات نوکِ قلم یا زبان پر لا کر ایک فن کار کو ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کیفیت میں ترجمہ کرنا اپنے زخموں سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ چُون کہ میری اپنی زندگی ایک طویل داستانِ غم ہے۔ جس کی جھلک میری رُباعیات اور میرے قطعات میں جا بجا ملتی ہے۔ اس لیے ترجمہ کے لیے بھی طربیہ نظموں کی نسبت المیہ نظموں پر نظر پڑنا ایک قدرتی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے احباب مجھ پر الم پسندی کا الزام لگائیں مگر بقول شیلے ہمارے شیریں ترین نغمے پُر ملال ہی تو ہوا کرتے ہیں۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہُوا کہ کسی طویل انگریزی نظم کا ایک مرکزی خیال ذہن سے گزرا اور بعد میں رفتہ رفتہ وقت اور میلانِ طبع کے مطابق مَیں اس نظم کو مکمل

کرنے میں کوشاں رہا۔ ایسے مواقع پر بار بار اصل نظم کی سطروں کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑا۔ عرق ریزی سے بھی گریز نہیں کیا اور فنی پہلو کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خواہ مخواہ ایک نظم کو لے کر یہ تہیہ کر کے بیٹھ جاؤں کہ اس کا مکمل ترجمہ کر کے ہی اٹھوں گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی انگریزی نظموں کے کچھ حصے جن کے مطالعہ نے میرے ذہن میں کوئی پائدار نقش نہیں اُبھارا، ترجمہ کرتے وقت نظرانداز کر دیے گئے اور کولرج کی بعض نظموں کی طرح میں نے انھیں نامکمل چھوڑ دینے پر اکتفا کیا۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے میں اِس بات کا قائل ہوں کہ اردو زبان کو ورڈزورتھ کی طرح ایک مجتہد کی ضرورت ہے جو اسے بلاضرورت ابہام، مشکل پسندی، غیر مانوس تشبیہوں، دور افتادہ استعاروں اور تصنع سے پاک کر کے سلیس اور عام فہم بنائے۔ بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے بیشتر اردو مصنفین پر (کچھ قابلِ رشک مستثنیات کو چھوڑ کر) روایات کا بھوت سوار ہے اور جس طرح اٹھارویں صدی کے انگلستان میں ایک "مصنوعی خالص ادبی زبان" نے ادیبوں کے طرزِ تحریر پر غیر قدرتی پابندیاں لگا کر زبان کا دائرہ محدود کر رکھا تھا۔ اسی طرح ہمارے کئی قدامت پسند ادیب آج بھی اس تنگ دائرے سے باہر نہیں نکلنے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید انقلابی دور میں اُردو کو سہل اور عام فہم بنا کر روزمرہ کی بول چال کے قریب تر لے آنا زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فارسی ترکیبوں، اضافتوں اور "خالص ادبی زبان" کی زنجیروں سے مکمل طور پر آزاد ہو کر خالص ہندوستانی زبان میں شعر کہے ہیں۔ تاہم جہاں تک ہو سکا میری کوشش یہی رہی کہ یہ ترجمے مٹھی بھر ادیبوں اور نقادوں ہی کے لیے محدود نہ رہیں۔ بلکہ ادبیات کے طالب علموں کے علاوہ اُردو زبان سے واقفیت رکھنے والا ایک عام شخص بھی ان سے استفادہ کر سکے۔ کیوں کہ ترجمے کو اگر اصل سے بھی مشکل بنا دیا جائے تو وہ ترجمہ نہیں بلکہ ایک الجھن بن کر رہ جاتا ہے۔ بے شک ترجمے کی باریکیوں اور لطافتوں کی تو وہی شخص داد دے سکتا ہے جس نے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور اصل نظمیں بھی پڑھی ہوں لیکن میں اپنے ترجموں کو بھی

کامیاب سمجھوں گا اگر دونوں زبانوں کے ماہرین کے علاوہ وہ اصحاب بھی پڑھ کر لُطف اندوز ہو سکیں جن کو اصل سے واقفیت نہ ہو۔

انگریزی ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے مَیں اس زبان کی شاعری سے بالخصوص متاثر اور لطف اندوز ہوا اور میری ہمیشہ خواہش رہی کہ جن انگریزی نظموں کو میں نے چٹخارے لے لے کر پڑھا ہے وہ ہماری قومی زبانوں میں منتقل ہو کر ہمارے ملک کے ادبی سرمایہ کا جزو بن جائیں۔ ان ترجموں کا ایک مقصد اُردو شعرا کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا بھی تھا کہ دوسری زبانوں کی شاعری میں (ہمارے اپنے بہترین ادبی نمونوں کی طرح) خمِ ابرو، ساقی و جام، اور حدیثِ لب و رُخسار کے علاوہ اور بھی بے شمار موضوعاتِ سخن موجود ہیں اور اس اہم ادبی مسئلہ پر غور کر کے ہم اردو ادب کو ایک نیا حُسن دے سکتے ہیں۔

"نسیمِ مغرب" میں بیشتر مغربی شعرار کی نظموں کے ترجمے ہیں۔ انگریزی میں شعر کہنے والی صرف ایک ایشیائی شاعرہ سروجنی نیڈو کی نظم "بیخودی" شامل کر لی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ نظم جس کا بہار کی ایک صبح کو بے خودی کے عالم میں ترجمہ ہو گیا۔ اربابِ ذوق نے پسند کی اور انہی کے مشورہ پر اسے موجودہ مجموعے میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا۔ اس مجموعہ میں اُنیسویں صدی کے آخیر تک کہی گئی انگریزی نظموں کے ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔ اور اگر میری اِس حقیر ادبی خدمت سے مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں عصرِ حاضر کے چند انگریزی شعرار کے شہ پاروں کو اردو نظم کا لباس دے کر شامل کر دیا جائے۔

کئی سخن فہم کرم فرماؤں نے نہایت فیاضی سے میرے بعض ترجموں کے اصل سے بہتر ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا سہرا اُردو زبان کے سر ہے جو اتنی زرخیز اور لچک دار واقع ہوئی ہے کہ لطیف سے لطیف جذبات اور خیالات کے اظہار سے بھی قاصر نہیں۔ لیکن اگر میرے ترجموں میں کسی قسم کی خامی رہ گئی ہو تو اُمید ہے کہ اسے مترجم کے عجزِ طبع پر محمول کیا جائے گا۔

آخیر میں پروفیسر تلوک چند محرومؔ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جو طالب علمی کے زمانے سے میری رہنمائی کرتے آئے ہیں اور اُنھوں نے "نسیم مغرب" کی اشاعت کے موقع پر بھی مجھے کئی کارآمد مشورے دیے نیز ابوالفصاحت اُستاد جوشؔ ملسیانی کا میں خاص طور پر سپاس گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کو کئی لغزشوں سے پاک کیا اور جن کی شفقت اور دُعاؤں کے بغیر "نسیم مغرب" کا موجودہ شکل میں رُونما ہونا ممکن نہ تھا۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ۔ پروفیسر احتشام حسین - پروفیسر فراقؔ گورکھپوری۔ عالی جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ۔ ملک اوم پرکاش آنند۔ علامہ منوّر لکھنوی اور آنریبل پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب نے میری بہت حوصلہ افزائی اور امداد فرمائی ہے جس کے لیے اِن تمام حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔

گورنمنٹ کالج۔ لُدھیانہ
۲۴ راپریل ۱۹۶۱ء

امیر چند بہارؔ

دُعا

(جان ہنری نیومین کی مشہور نظم LEAD KINDLY LIGHT کا ترجمہ)

(۱)

ہر سمت مُہیب تیرگی ہے　　یارب مری جان پہ بنی ہے
تیرا ہے فقط مجھے سہارا
منزل سے ابھی ہُوں مَیں بہت دُور　　تھوڑا سا بھی راہ میں نہیں نُور
چلنے کا نہیں ہے مجھ میں یارا
اب پاؤں بھی ڈگمگا رہے ہیں　　یارب ہے تِرا ہی اک سہارا
بس گام دو گام رہبری کر　　رحمت کا ذرا سا ہو اشارا

(۲)

ہے قابلِ رحم خستہ حالی　　کب تک یہ رہے گی پائمالی
اب تک نہ کبھی ہوا سوالی
خود اپنی میں راہ ڈھونڈتا تھا　　ڈھونڈا نہ کبھی تِرا سہارا
تنگ آکے ہی اب تجھے پکارا
دِل میں تھی اگرچہ اک خلِش سی　　مَیں نام و نمود پہ فدا تھا
سر میں تھا بھرا ہُوا تکبّر　　اب میری خطا کو بھول ہی جا

(۳)

اب تک رہا سر پہ ہاتھ تیرا　　چھوڑا نہیں تُو نے ساتھ میرا
لیکن ابھی دُور ہے سویرا

باقی ہے ابھی تو ظُلمتِ شب　　کیا جانے طلوعِ صبح ہو کب

بس ایک نگاہ مُجھ پہ یا رب!

ہو جائے گی جب سحر ہویدا　　آجائے گی سامنے تجلّی

جو آنکھ سے ہو گئی ہے اوجھل　　ہر دم ہے مجھے تلاش جس کی

(نوٹ) یہ نظم مہاتما گاندھی کی پسندیدہ پرارتھنا تھی۔

محبّت

(شیکسپیر کے سانٹ .. .. LOVE کا ترجمہ)

ہمارا یہ عقیدہ ہے جہاں سچّی محبت ہو
وہاں کوئی رکاوٹ دو دلوں میں آ نہیں سکتی
محبّت وہ نہیں ہے جو بدل جائے بدلنے پر
خزاں میں بھی محبّت کی کلی مرجھا نہیں سکتی

محبّت ہے کسی مضبوط سے مینار کی صورت
جسے طوفان ٹکّر مار کر لرزا نہیں سکتے
محبّت ہے وہ اک اونچا ستارہ جس کی رفعت کی
ہمیں ہو کچھ خبر لیکن حقیقت پا نہیں سکتے

گلابی ہونٹ اور گالوں کی رعنائی نہیں رہتی
حسیں چہرے نہیں رہتے دلآرائی نہیں رہتی
محبّت وقت کی رفتار سے آزاد ہے لیکن
محبّت پر قضا کی کار فرمائی نہیں رہتی

محبّت کے سوا دنیا کی ہر ایک چیز فانی ہے
یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر عاقل نے مانی ہے۔

کسی کی یاد

(شیکسپیر کے سانٹ بعنوان FORTUNE AND MEN'S EYES کا ترجمہ)

حال پر اپنے جو پڑتی ہیں نگاہیں میری
کبھی تقدیر سے نالاں کبھی خود سے برہم
آسماں کو بھی ہلا دیتی ہیں آہیں میری
ساکنِ عرش سے کرتا ہوں شکایت پیہم

کاش! بر آتی کوئی تو مرے دل کی اُمّید
کوئی محبوب کوئی چاہنے والا ہوتا
کچھ ہُنر ہوتا، ہُنر میں نظر آتی تجدید
رنگ ڈھنگ اپنا زمانے سے نرالا ہوتا

اِس طرح خود سے جو بیزار سا ہو جاتا ہوں
ناگہاں جانِ وفا تیرا خیال آتا ہے
جیسے ہنگامِ سحر مُرغ پَرافشاں ہو کر
گیت گاتا ہُوا گردُوں پہ پہنچ جاتا ہے

پھر تری یاد میں جب محو مَیں ہو جاتا ہُوں
تاجداروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ہُوں!

تیئسویں سالگرہ پر

(ملٹن کے سانٹ ON TWENTY THIRD BIRTH DAY کا ترجمہ)

چھین لیں وقت نے تیئس بہاریں میری
آہ! اِس رہزنِ عیّار نے مجھ کو لُوٹا
تیز گامی سے بہاریں تو ہُوئی ہیں رُخصت
شاخِ ہستی سے مگر غُنچہ نہ کوئی پھُوٹا!

کون لائے گا یقیں دیکھ کے صُورت میری
کون مانے گا کہ مجھ پہ بھی بہار آئی ہے
ہوش کی آنکھ بھی اب تک نہیں کھُلنے پائی
یہ وہ دولت ہے جو اغیار نے ہی پائی ہے

خیر جو کچھ بھی ہے سب ٹھیک ہے سب اچّھا ہے
اِس میں مُضمر ہے کوئی راز ہمیں کیا معلوم!
قلمِ کاتبِ تقدیر نے جو لکھّا ہے
اُس میں حکمت ہے کوئی، اُس کا ہے گہرا مفہوم!

جس بھی عالم میں ہیں جس رنگ میں بھی انساں ہیں
خالقِ کُل کی نگاہوں میں تو سب یکساں ہیں!

اَندھا ہو جانے پر

(مِلٹن کے مشہور سانٹ ON HIS BLINDNESS کا ترجمہ)

مَیں سوچتا ہوں کیسے بصارت چلی گئی
اندھیر ہو گیا میرے عہدِ شباب میں!
مجھ بد نصیب کی ابھی آدھی کٹی تھی عمر
اشعار بند رہ گئے دل کی کتاب میں!
جی چاہتا ہے شانِ الٰہی رقم کروں
ورنہ خدا سزا ہی نہ دے دے عتاب میں!
گھبرا کے پُوچھتا ہُوں الٰہی میں کیا کروں
فوراً صدا یہ آتی ہے دل سے جواب میں!

مِلٹن ترا خدا تو بڑا بے نیاز ہے
وہ تو بڑا علیم ہے دانائے راز ہے
راضی رہے خُدا کی رضا پر جو آدمی
اُس کے خلوص میں بھی نہیں ہے کوئی کمی!
جو صبر و اشتیاق سے کرتے ہیں انتظار
اُن کا بھی ذاتِ پاک کے بھگتوں میں ہے شُمار

نادانی

پوپ کی نظم HUMAN FOLLY کا ترجمہ

جس قدر بھی علم یا دولت کسی کے پاس ہے
اپنی یکتائی کا اُتنا ہی اُسے احساس ہے
خوش ہے دانا وہ سمجھتا ہے کہ ہوں دانائے راز
خوش ہے ناداں بھی کہ ان جھگڑوں سے ہے وہ بے نیاز
اہلِ ثروت کو تو اپنے مالِ وزر پہ ناز ہے
بے نوا خوش ہے کہ خود اُس کا خدا دمساز ہے
دیکھئے مستی میں کیسے رقص کرتا ہے گدا
ایک دیوانہ بھی ہے اپنی جگہ فرماں روا
کیمیا گر چاہے مُفلس کیوں نہ ہو مسرُور ہے
شاعرِ غم گیں بھی شعروں کے نشے میں چُور ہے
جس کو دیکھو اُس کے دل میں اِک خیالِ خام ہے
دیکھئے کتنا تکبّر اِس جہاں میں عام ہے
آدمی رہتا ہے اکثر ایک جذبے کا شکار
اک فقط اُمید پہ ہے زندگی کا انحصار
ایک بچّہ گدگُدانے سے بھی خوش ہوجائے گا
ایک معمولی کِھلونا اس کا دِل بہلائے گا

پھر جوانی میں کوئی خوشتر کِھلونا چاہیے
یہ کِھلونا کچُھ پسندیدہ بھی ہونا چاہیے
چاہتا ہے اور آگے جاکے وہ اطلس حریر
یا کوئی تسبیح لے کر کھیلتا ہے مردِ پیر
الغرض ہر وقت اُس کے دل کو بہلاتا ہے کھیل
تھک کے رہ جاتا ہے آخر ختم ہو جاتا ہے کھیل

گورِ غریباں

(گرے کی شہرہ آفاق نظم ELEGY WRITTEN IN COUNTRY CHURCHYARD کا ترجمہ)

ہُوا روپوش جب مہرِ منورِ چشمِ گیتی سے
سکوتِ شام میں واپس چلے کھیتوں سے چوپائے
مشقت کا تھکا ماندہ ہُوا دہقان بھی رُخصت
فقط میں رہ گیا ہوں اِس جگہ یا ڈوبتے سائے

سیاہی سی فضا میں گھل گئی آہستہ آہستہ
سوادِ شام کا ماحول پر چھایا ہے سنّاٹا
مگر سُنتا ہوں ایسے میں کبھی تو تان بھونرے کی
کبھی بانگِ جرس سے کانپتا ہے دل بیاباں کا

کبھی ٹوٹے ہوئے گنبد سے اُلو بول اٹھتا ہے
مہِ تاباں کو اپنا حال یہ کہہ کر سناتا ہے
مجھے کیوں گوشۂ عُزلت میں کوئی چھیڑنے آئے
نکل کر گھر سے ویرانے میں کیوں اِنسان آتا ہے

اُدھر کچھ مُولسریوں کے درختوں کی قطاروں میں
کئی تنگ اور بوسیدہ سی قبریں بھی ہیں پوشیدہ
یہ بوسیدہ سی قبریں چادریں ہیں جن پہ سبزے کی
انھیں قبروں میں ہیں اِس گاؤں کے اسلاف خوابیدہ!

نسیمِ صبحگاہی یا ابابیلوں کی آوازیں
انھیں اب خوابِ غفلت سے جگانے کے نہیں قابل
صدا مرغے کی سنتے ہیں نہ غوغا اہلِ صحرا کا
غرض کوئی بھی شے اِن کو اُٹھانے کے نہیں قابل!

•

ہوئیں اِک قصۂ پارینہ اب ماضی کی وہ شامیں
جب اِن کی واپسی پر گھر میں ہو جاتی تھی تابانی
نہ چشمِ منتظر سے بیبیاں اب راہ دیکھیں گی
نہ بچّے دوڑ کر چُومیں گے اِن لوگوں کی پیشانی!

درانتی ہاتھ میں لے کر کبھی آتے تھے کھیتوں میں
کبھی یہ ہل چلا کر سخت ڈھیلے پھوڑ دیتے تھے
یہی ہیں جو خوشی سے ہانکتے تھے اپنے بیلوں کو
یہی اک ضرب سے گردن شجر کی توڑ دیتے تھے

حِقارت کی نظر سے دیکھنا اِن بے نواؤں کو
امیروں، کج کُلاہوں کے لیے ہرگز نہیں اَچھّا
یہ مانا بے مزہ ہے داستانِ زندگی ان کی
غریبوں پر مگر زیبا نہیں یہ خندۂ زیبا!

بہت ناداں ہیں جو نازاں ہیں اپنی شانِ شوکت پر
یہ دُنیا چند روزہ ہے یہاں ہر چیز ہے فانی
جہاں ہر چیز کا انجام ہو مٹّی میں مِل جانا
وہاں کیا چیز ہیں یہ تاجِ شاہی، تختِ سُلطانی!

نہیں کتبے کہیں اِن بے نواؤں کے مزاروں پر
برائے فاتحہ خوانی یہاں کوئی نہیں آتا
نظر آتے نہیں ہیں پھُول بھی اِن خستہ قبروں پر
یہ عالم ہے چراغ اِن پر کبھی روشن نہیں دیکھا!

بنائیں لاکھ تصویریں کسی انساں کی تُربت پر
جب اُڑ جاتا ہے پنچھی سانس کا پھر آ نہیں سکتا
خوشامد ایک مُردے کو تسلّی دے نہیں سکتی
ہمارا پھُول برسانا اُسے بہلا نہیں سکتا!

بہت ممکن ہے اِن قبروں میں کچھ ایسے بھی انساں ہوں
کہ جن کے دل میں ہو گا رقص فرما نورِ یزدانی
چھپا ہو گا کئی لوگوں میں جوہر حکمرانی کا
کئی اِن میں سے ہوں گے فنِ موسیقی میں لاثانی!

مقدّر نے مگر فرصت نہ دی اِن تیرہ بختوں کو
کہ اپنے بے بہا جوہر زمانے کو دکھا سکتے
فلاکت نے مِلایا خاک میں اونچے ارادوں کو
نہ تھا یہ اُن کی قسمت میں کہ وہ تعلیم پا سکتے!

ہزاروں گوہرِ تاباں ہیں پنہاں قعرِ دریا میں
نہاں ہے اہلِ دُنیا سے مگر ان کی درخشانی
کئی ایسے بھی دِلکش پھول صحراؤں میں کھلتے ہیں
شمیمِ جانفزا ہوتی ہے جن کی نذرِ ویرانی

کئی ہوں گے یہاں مردِ مجاہد ہیمپڈن جیسے
زبانِ خلق پہ ضرب المثل ہو جن کی بے باکی
کئی گمنام مِلٹن اس جگہ سوئے ہوئے ہوں گے
کئی نِھے کرامویل، اُتنی نہ تھی گو اُن میں سفّاکی!

زمانے نے اِنھیں فرصت نہ دی جوہر دکھانے کی
وگرنہ اپنا سِکّہ ساری دُنیا پر بِٹھا دیتے
زباں کے زور سے مسحُور کرتے سُننے والوں کو
ستم رانوں کے چھکّے زورِ بازو سے چھُڑا دیتے!

چلو اچھا ہُوا شاید اِسی میں مصلحت ہو گی
بڑے بن کر وہ شاید دہر میں فتنے اُٹھا دیتے
جہاں گیری کے لالچ میں بہاتے خون کے دریا
جہاں سے نام تک مہر و محبّت کا مٹا دیتے!

بڑے بن کر کِسے معلوم وہ کیا کیا ستم ڈھاتے
صِداقت کو دبا دیتے، مُروّت کو بھُلا دیتے
رئیسوں کی خوشامد میں قصیدہ خوانیاں کرتے
یہ مُمکن تھا کہ بٹّہ عظمتِ فن پر لگا دیتے!

خُدا کا شُکر ہے ایسا کبھی ہونے نہیں پایا
رہے بیگانہ شہروں کی سفیہانہ کشاکش سے
بڑے آرام سے عُمریں بسر کیں گاؤں میں رہ کر
نہ اُن کا کوئی دُشمن تھا نہ وہ دُشمن کسی کے تھے!

جئے اور مر گئے یہ لوگ گُم نامی کے عالم میں
مگر اِن بے نواؤں کی بھی کچھ توقیر لازم تھی
شکستہ لوحِ تُربت پر لکھی جو چند سطریں ہیں
انھیں پڑھتے ہی ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں کئی راہی!

یہی سطریں تو اُن کے مَرثیے کا کام دیتی ہیں
پَتہ دیتی ہیں اُن کے نام کا، جائے ولادت کا
نظر کے سامنے لاتی ہیں یہ انجامِ ہستی کو
سبق آموزیوں میں ایک دفتر ہیں نصیحت کا!

بھلا اتنا بھی پتّھر کا جگر کس شخص کا ہوگا
کہ جس کی آنکھ مرتے وقت بھی پُر نم نہ ہو جائے
جہانِ رنگ و بُو سے کُوچ کرتے وقت بھی جس کو
جہانِ رنگ و بُو کی یاد رہ رہ کر نہ تڑپائے!

سہارا ڈھونڈتا ہے مَرتے دَم بھی غمگُساروں کا
دلِ نافہم کی مَر کر بھی نادانی نہیں جاتی
لحد میں بھی ہماری حسرتیں بیدار رہتی ہیں
ہماری خاک سے بھی خوئے انسانی نہیں جاتی!

پرائی آگ میں تُو جل رہا ہے اے دلِ ناداں
سمجھ لے ایک دن تجھ کو بھی ہو جانا ہے خاکستر
انھیں قبروں میں جب تُو ایک دن سویا ہُوا ہوگا
ترا نام و نشاں بھی کوئی پُوچھے گا یہاں آکر

کوئی دہقانِ پیر اُس کو یہی شاید بتائے گا
سحر کے وقت وہ گلگشت کو ہر روز جاتا تھا
سُبک گامی سے اکثر روندتا جاتا تھا سبزے کو
بلندی پر، کبھی سُورج کی کرنوں میں نہاتا تھا

یُونہی پھرتے پھراتے پھر خیابانوں میں آجاتا
وہاں اِس پیڑ کے سائے میں وہ آرام کرتا تھا
کبھی پہروں لبِ جُو لیٹ رہتا تھا مسرّت سے
اِسی عالم میں وہ اپنی سحر کی شام کرتا تھا

کبھی نفرت بھری اِک مُسکراہٹ لے کے چہرے پر
غمِ دوراں سے گھبرایا ہُوا معلوم ہوتا تھا
کبھی ہو کر پریشاں حال پھرتا تھا بیاباں میں
کسی کافر کا ٹھکرایا ہُوا معلوم ہوتا تھا

مگر پھر ایک دِن میں نے وہاں اُس کو نہیں دیکھا
نہ جنگل میں، نہ دریا پر، نہ پیڑوں کے تلے پایا
خُدا جانے یکایک کس طرح وہ ہو گیا غائب
غضب ہے دُوسرے دن بھی نظر مُجھ کو نہیں آیا

بالآخر تیسرے دِن اُس کی میّت سامنے آئی
جنازے کو اُٹھائے خلق وقتِ نوحہ خوانی تھی
وہ دیکھو پیڑ کے نیچے جو مرقد ہے اُسی کا ہے
پڑھو نزدیک جا کر تم عبارت لوحِ تُربت کی

کتابہ

یہاں کُنجِ لحد میں چین سے سویا ہُوا ہے وہ
رہا جو عُمر بھر دُنیا کی ہر نعمت سے بیگانہ
وہ مُفلس تھا مگر علم و ہُنر سے تھا نہ بے بہرہ
ہمیشہ اُس کے لب پر سوزِ اُلفت کا تھا افسانہ

سخاوت اور اخلاص اُس کی فطرت میں تھے پوشیدہ
انھیں اوصاف سے اُس پر فِدا ہے رحمتِ باری
اُسے تھی بے نواؤں، بے کسوں کے ساتھ ہمدردی
اِسی باعث خُدا کو بھی ہے منظور اس کی غم خواری

فسانہ ہو چکا جب ختم اُس کی زندگانی کا
اب اُس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ناروا ہوگا
اَماں پائے گا وہ مردِ خُدا پہلوئے یزداں میں
محافظ عالمِ بالا میں بھی اُس کا خُدا ہوگا!

میری سلمیٰ ہے پھول کی پتّی

(رابرٹ برنز کی مشہور نظم MY LOVE IS LIKE A RED RED ROSE کا ترجمہ)

(۱)

میری سلمیٰ ہے پھول کی پتّی — جس پہ تازہ بہار آئی ہو
کوئی میٹھی سی راگنی جیسے — اک مُغنّی نے گنگنائی ہو

(۲)

حُسن بیشک ہے لاجواب ترا — عشق میرا بھی کم نہیں لیکن
بحر جب تک نہ خشک ہو جائیں — تجھ سے ترکِ وفا نہیں ممکن

(۳)

جب تک ارض و سمایہ قائم ہیں — اور بحرِ رواں میں پانی ہے
نہ اٹھاؤں گا میں وفا سے ہاتھ — یہ وفا میری زندگانی ہے

(۴)

اَلوداع، اَلوداع اے سلمیٰ — اب تو جانا ہے دُور جاؤں گا
چاہے دُوری ہو لاکھ میلوں کی — عہد کرتا ہوں واپس آؤں گا

دُنیا

(ورڈزورتھ کے سانٹ THE WORLD کا ترجمہ)

ہائے افسوس! ہمیں جان سے دنیا ہے عزیز
رات دن زر کی پرستش میں لگے رہتے ہیں
ہم کو قُدرت کے نظاروں سے ذرا پیار نہیں
کتنے بد ذوق ہیں پیسے کو خُدا کہتے ہیں!

بحر میں چاند کی کرنوں کی جھلک کیا کہنا
کتنی پُرکیف بیاباں کی ہوا ہوتی ہے
جو خوشی ملتی ہے اِس گوشۂ تنہائی میں
رُوح کے واسطے جاں بخش غذا ہوتی ہے!

حیف صد حیف! ہمیں ان سے ذرا پیار نہیں
ایسی کوتاہ نگاہی پہ تو حیراں ہوں میں
میں نے ٹھانی ہے کہ قُدرت کی کروں گا پُوجا
یہ اگر کُفر ہے اِس کُفر پہ نازاں ہوں میں

مَیں جب آغوش میں فطرت کی چلا جاؤں گا
ذرّے ذرّے سے عیاں نورِ خُدا پاؤں گا!

آغازِ بہار

(ورڈزورتھ کی نظم LINES WRITTEN IN EARLY SPRING کا ترجمہ)

(۱)

مَیں بیٹھ گیا سبزۂ گُل زار پہ اک روز
مرغانِ خوش الحاں کی ہر اک تان تھی دلدوز
کیفیتِ دل ایسے میں ہوتی ہے جنوں خیز
بن جاتے ہیں جذبات خوشی کے بھی غم انگیز

(۲)

قُدرت کی ہر اک چیز میں تھا حُسنِ دلآرا
دل شاد ہُوا دیکھ کے یہ جلوۂ زیبا
لیکن یہ ذرا سوچ کے پھر ہو گیا ناشاد
کر رکھا ہے انسان نے انسان کو برباد

(۳)

تھا جال بچھا سُنبلِ پُر پیچ کا ہر سُو
تھے گردنِ نرگس میں گُلِ زرد کے بازو
ہوتا ہے گزُر باغ سے جب موجِ صبا کا
ہر پھُول پہ ہوتا ہے اثر اس کی ادا کا

(۴)

مُرغانِ چمن گرد مرے کھیل رہے تھے
کیا جانیے کیا خاص خیالات تھے اُن کے
ہاں دل پہ مرے نقش ہوئی جاتی تھی یہ بات
سرشار ہیں، سرمست ہیں مُرغانِ خوش اوقات

(۵)

خواہاں تھی کروں بادِ بہاری کو گرفتار
پنکھا سا بنی جاتی تھی ہر شاخِ چمن زار
رہ رہ کے تصوّر یہ مرے ذہن میں آیا
کیا لُطف ہے قُدرت کے مناظر میں خُدایا

(۶)

ہے میرے عقیدے میں اگر کوئی صداقت
ایسا ہی اگر ہے یہ طرب خانۂ قُدرت
پھر کیوں نہ ہو یہ سوچ کے دل مضطر و ناشاد
انسان نے کر رکھا ہے انسان کو برباد

حُسنِ کامِل

(بائرن کی نظم SHE WALKS IN BEAUTY کا ترجمہ)

وہ لطیف پیکر و خوش ادا ہے کچھ ایسی دِلکش و دلربا
رُخِ شب پہ نور سا جس طرح کبھی دفعتہً ہو بکھر گیا
وہ رُخِ جمیل ہے دِلنشیں، وہ نگاہِ ناز ہے سُرمگیں
وہ کچھ اس بلا کی ہے دِلرُبا کہ ہر ایک عضو ہے خوشنما
وہ ہے سروِ قامت و گل بدن، ہر ادا میں ہے اس کی بانکپن
اُسے حُسن ایسا عطا ہوا کہ جو آفتاب سے ہے سوا
وہ گداز عارضِ احمریں، وہ دراز گیسوئے عنبریں
ہے بہارِ ناز وہ نازنیں، کوئی کہہ دے اُس میں کمی ہے کیا
وہ جو بُت ہے دُشمنِ دین وجاں کبھی ہوتا ایسا نہ دِلستاں
یہ جو رنگ ہے رُخ و زلف کا کم و بیش ہوتا اگر ذرا
رُخِ پُرفسوں کی چمک دمک دلِ پُرسکوں کی ہے اِک جھلک
یہ حسین چہرۂ خوشنما ہے اِک آئینہ دلِ صاف کا
وہ جبینِ داغ دہِ قمر پہ ضیائے حُسن ہے جلوہ گر
وہ لطیف عارضِ کیف زا پہ ہے اک تبسّمِ جاں فزا

یہ تبسّمِ لبِ گُلؔ فشاں ہے بہارِ زیست کی داستاں
ہے جبیں سے نُور جو رُو نما وہ ہے پرتوِ دلِ بے ریا
یہ جمال و حُسن و شگفتگی ہیں دلیل طینتِ پاک کی
یہ نشان کہتے ہیں برملا کہ وہ لالہ فام ہے باصفا!

جوانی اور بڑھاپا

(لارڈ بائرن کی نظم YOUTH AND AGE کا ترجمہ)

(۱)

دُنیا میں نہیں اس سے بڑی کوئی مُصیبت
جذبات کا مرجانا قیامت ہے قیامت!
جب بُجھتا ہے دِل کوئی مسرّت نہیں رہتی
جذبات میں اگلی سی حرارت نہیں رہتی!

(۲)

جو لوگ لُٹا بیٹھے ہوں سرچشمہ خوشی کا
لیتے ہیں وہ کم بخت گُناہوں کا سہارا
وہ قُلزمِ ہستی میں بھٹکتے ہی رہیں گے
واماندہ ہیں ساحل پہ کبھی آ نہ سکیں گے!

(۳)

مُردوں کی طرح رُوح ٹھٹھر جاتی ہے اُن کی
اوروں کا ہے غم اُن کو نہ کچھ فکر ہے اپنی
احساس کا سرچشمہ ہی جب سُوکھ چُکا ہے
پھر اُن کے لیے زِیست میں کیا خاک دھرا ہے!

(۴)

ممکن ہے کہ یہ لوگ نظر آئیں کبھی شاد
گو راتوں کی اب نیند وہ کر بیٹھے ہیں برباد
کیا پُوچھتے ہو ان کے تبسُّم کی حقیقت
سبزے میں نہاں جیسے ہو اِک خستہ عمارت!

(۵)

اے کاش پلٹ آئے وہ ماضی کا زمانہ
اِک بار پھر آ جائے مُجھے دِل کو رُلانا
صحرا میں کہیں پیاسے کو جیسے ملے پانی
تسکین بہت دے گی مجھے اَشک فشانی

نغمۂ شبینہ

(شیلے کے ایک گیت INDIAN SERENADE کا ترجمہ)

(۱)

بہکی بہکی ہوائیں چلتی ہیں
نورِ افلاک سے برستا ہے
رات کی خامشی میں رہ رہ کر
مجھ کو تیرا خیال ڈستا ہے!
نیند کی گود سے لپک کر میں
جانِ من! بے قرار آیا ہوں
کھینچ لایا ہے مجھ کو اک جذبہ
اور بے اختیار آیا ہوں!

(۲)

دیکھ سیمیں ندی کے سینے پر
توڑتی ہیں ہوائیں دم اپنا
بوئے گُل اس طرح پریشاں ہے
جیسے خواب وخیال کی دُنیا!

بُلبُلِ بے قرار کا نغمہ
ڈُوب جاتا ہے دل میں ہی گھُٹ کر
میں بھی ایسے ہی گھُٹ کے مرجاؤں
تیرے سیمیں صبیح سینے پر!

(۳)

مُجھ کو درکار ہے سہارا اب
تیری سیمیں گُداز باہوں کا
دِل کے زخموں کی چارہ سازی کر
غم سے سینہ فگار ہے میرا!

میرے گالوں پہ مُردنی سی ہے
دل کی دھڑکن بھی تیز ہے ہمدم
اس طرح بھینچ مجھ کو سینے سے
ختم ہو جائے شورشِ پیہم!

رموزِ عشق

(شیلے کے گیت LOVE'S PHILOSOPHY کا پہلا بند)

آبِ رواں کی مست دھار ہو گئی غرقِ جُوئبار
دیکھئے جُوئبار بھی بحر سے جا گلے ملی
مست ہوائیں باربار ہوتی ہیں کیسے ہمکنار
پیر و جواں کو دیکھئے کون و مکاں کو دیکھئے
دہر میں ہر جگہ نشاط یہ ہے نظامِ کائنات
ہر جگہ خوب پیار ہو ہر کوئی ہمکنار ہو

لیکن اَے میرے ہمنشیں
تُو میرے پاس کیوں نہیں!

عالمِ یاس میں

(شیلے کی نظم STANZAS WRITTEN IN DEJECTION کے ایک بند کا ترجمہ)

نہ ہے برقرار صحت — نہ سکونِ قلب حاصل
مِری لُٹ گئیں اُمیدیں — مِرا دل ہے مُرغِ بسمل!

نہ وہ دولتِ قناعت — مُجھے ہو سکی مُیسّر
جو نصیبِ عارفاں ہے — جو ہے مال و زر سے بڑھ کر!

نہ تو پا سکا میں شُہرت — نہ کوئی مقامِ اعلیٰ
نہ مِلی مُجھے فراغت — نہ میں دِلرُبا کِسی کا!

کئی لوگ ہیں جہاں میں — جِنھیں ایک بھی نہیں غم
مُجھے مِل گیا ازل سے — فقط اِضطرابِ پیہم!

کوئی اور لوگ ہوں گے — جو ہیں شاد کام و خنداں
مِری زندگی میں لیکن — غم و یاس ہیں فراواں!

بادِ مغرب سے خطاب

یہ نظم ۱۸۱۹ء میں لکھی گئی اور اگلے سال شایع ہوئی۔ اُن دِنوں شیلے اِٹلی میں قیام پذیر تھا۔ ایک دِن سخت آندھی آئی۔ اس کے بعد گھنگھور گھٹائیں فضا پر محیط ہوگئیں۔ اور بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ مُوسلا دھار بارش ہوئی۔ اُسی روز یہ نظم معرضِ وُجود میں آئی۔

اِس نظم کو انگریزی شاعری کا ایک بیش بہا ہیرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار کے باعث اِس کو سمجھنا آسان نہیں۔ پہلے تین حصّوں میں زمین پر، آسمان پر اور پھر سمندر پر بادِ مغرب کی سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں۔ بادِ مغرب زمین پر بیج بکھیرنے کے علاوہ گلے سڑے پتّوں کو اپنے ساتھ اُڑا لے جاتی ہے۔ اسی طرح آسمان پر بادلوں کو اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہے اس کی آمد پر سمندر کی لہریں قطاروں میں بٹ کر اس کے لیے رستہ بنا دیتی ہیں۔ یہ تینوں بند جو محض بیانیہ تھے ترجمے میں نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

چوتھے بند میں شاعر بادِ مغرب سے اپنے لیے مدد کی التجا کرتا ہے۔ اور پانچویں بند میں وہ اس کے ذریعے دُنیا تک اپنا پیغام پہنچا دینا چاہتا ہے۔

(بہار)

(شیلے کی مشہور نظم ODE TO THE WEST WIND کے آخری دو بند)

(۱)

ہوتا جو میں درخت کا پتہ گرا ہوا
اُڑتا مثالِ ابر ترے ساتھ اے ہوا
اے کاش موج بن کے ترے ساتھ رہ سکوں
پرواز کی جو تجھ میں ہے طاقت وہ بانٹ لوں
میں بھی تری طرح ہی سرِ پُر غرور ہوں
گو تجھ سے کم ہوں پھر بھی میں نازاں ضرور ہوں
اب ختم ہو چلی ہے جوانی کی داستاں
وہ ولولے وہ زور نہ جانے گئے کہاں
ہوتا جو اب بھی جوش رگوں میں شباب کا
یوں بے بسی میں تجھ سے نہ کرتا یہ اِلتجا:
اے بادِ غرب مجھ کو ذرا ساتھ لے کے چل
کانٹوں میں پھنس گیا ہوں مجھے ہاتھ دے کے چل
میں دب گیا ہوں بارِ غمِ روزگار سے
تنگ آ گیا ہوں گردشِ لیل و نہار سے
مجھ کو اٹھا کہ میں بھی ترا ہم شعار ہوں
خود سر ہوں، تُند و تیز ہوں، برق و شرار ہوں

(۲)

بَن کی طرح ہے مجھ میں بھی پنہاں نوائے چنگ
دونوں پہ چھا چکا ہے اگرچہ خزاں کا رنگ

غم آشنا کریں گے تری نغمگی کو ہم
نغمے کی چاشنی کو بڑھاتا ہے اَور غم

آ مجھ سے ہمکنار ہو اے بادِ تند خُو
اپنا بنا مجھے بھی کہ ہے کارساز تُو

میرے خیال سارے جہاں میں بکھیر دے
اک انقلاب آئے گا میرے ہی فیض سے

اِک آگ سی لگاؤں گا سحرِ سُخن سے میں
یہ شعر بھی دبی ہوئی چنگاریاں تو ہیں

ڈوبی ہوئی ہے ظلمتِ شب میں ابھی فضا
یہ پیش گوئی سوئے ہوؤں کو ذرا سُنا:

گو ہے خزاں کے جَور سے پامال زندگی
اُمید رکھ کہ آئے گی فصلِ بہار بھی!

ہراس

یہ سانٹ جان کیٹس کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے شاعر کے دل میں بے وقت موت کا خدشہ نظم کا موضوع ہے۔ کیٹس کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اُس کا بھائی ٹام بھی اسی نامراد مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء میں جب اُس نے یہ نظم لکھی اُسے معلوم تھا کہ وہ اِس دُنیا میں صرف چند روز کا مہمان ہے۔ لہذا یہ سوچ کر اُسے سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اُس کی تقدیر نہ تو اُسے شاعری کے میدان میں جوہر دکھلانے کے لیے زندہ چھوڑے گی نہ ہی وہ اپنی محبوبہ فینی براؤن سے جی بھر کے محبت کر سکے گا۔ اس نظم کو لکھنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جان کیٹس اپنی ناتمام آرزوئیں دِل میں لے کر درگور ہو گیا۔

نظم کے ایک ایک لفظ سے یاس اور حسرت ٹپک رہی ہے۔

(بہار)

(جان کیٹس کے سانٹ WHEN I HAVE FEARS کا ترجمہ)

کتنے ارمان تڑپتے ہیں مرے سینے میں
پیشتر اس کے کہ تحریر میں یہ آجائیں
مجھ کو ڈر ہے کہ میں دُنیا سے چلا جاؤں گا
اپنے سینے میں اِن ارمانوں کو دفناؤں گا!

جھلملاتے ہوئے تاروں سے مرصّع یہ رات
کتنا رومان بھرا ہے مہِ تاباں، ہیہات!
اس سے پہلے کہ کچھ شعر میں اِن کی تصویر
مجھ کو ڈر ہے کہ مری پھوٹ نہ جائے تقدیر!

دائمی دید تری گو مری قسمت میں نہیں
پھر بھی پڑتی ہے نظر تجھ پہ جب اے زہرہ جبیں
ہوک سی اُٹھ کے یہ کہتی ہے کہ اے جانِ بہار
تجھ سے جی بھر کے کبھی کر نہ سکوں گا اب پیار!

پھر خیال آتا ہے اس دہر میں تنہا ہوں میں
عشق و شہرت کے یہ جذبات فقط دھوکا ہیں!

بے رحم حسینہ

یہ نظم اپریل ۱۸۱۹ء میں لکھی گئی تھی اور انگریزی ادب کی مقبول ترین نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ نظم ایک خیالی واقعہ پر مبنی ہے:

شدید سردی کا موسم تھا۔ شاعر ایک آشفتہ حال سپاہی کو پہاڑی پر اکیلا پھرتا ہوا دیکھ کر اُس کی آزردگی کا سبب پوچھتا ہے۔ سپاہی نے جواب دیا کہ ایک دفعہ کسی خوبصورت دوشیزہ سے اُس کی آنکھیں چار ہوگئیں۔ وہ اس حسینہ کے جھانسے میں آکر اس کے ساتھ ہولیا۔ لڑکی اُسے ایک غار میں لے گئی جہاں اُسے تھپکیاں دے کر سُلا دیا۔ نیند میں سپاہی نے ایک خواب دیکھا اور اپنے آپ کو ایک قید میں پایا جہاں کچھ اور لوگ بھی محبوس تھے۔ یکایک وہ چونک اُٹھا اور جب آنکھ کھولی تو نہ کہیں وہ حسینہ نظر آئی نہ وہ غار۔ جب سے اُس نے یہ خوابِ پریشاں دیکھا نہایت سراسیمگی کے عالم میں یہاں مارا مارا پھرتا ہے۔

نظم ناکامیٔ عشق کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔

(بہار)

(کیٹس کی مشہور رومانوی نظم LA BELLE DAME SANS MERCI کا ترجمہ)

شاعر

اَے دل آزردہ سپاہی! کچھ بتا یہ کیا ہُوا
رنگ تیرا زرد ہے۔ چہرا تِرا اُترا ہُوا
گھاس مُرجھائی ہوئی ہے اور فصلیں کٹ چکیں
دل لگی کا اور بھی کوئی یہاں ساماں نہیں
کِس لیے پھرتا ہے تنہا ایسے ویرانے میں تُو
کُچھ بتا ہم کو بھی کیا ہے تیرے دل کی آرزُو
تیرے ماتھے پہ پسینہ جیسے ہو تجھ کو بُخار
تیرا چہرہ تیرے دل کے درد کا آئینہ دار!

سپاہی

اِک پری زاد آئی تھی مجُھ کو نظر گلزار میں
بال لمبے، مست آنکھیں، شوخیاں رفتار میں
اِک ادائے ناز سے وہ مُجھ کو تڑپانے لگی
مُسکراتی اور شرماتی قریب آنے لگی
پاس آکر مجھ سے یُوں کہنے لگی وہ خوش ادا
"مَیں تمھاری ہُوں تمھیں پہ ہوگیا ہے دِل فدا"

میں نے کھایا اُس کی رِس گوہرفشانی کا فریب
ناز کا، انداز کا، اُٹھتی جوانی کا فریب
بیٹھ کر گھوڑے پہ پھر ہم جانبِ منزل چلے
جھومتی تھی رہ گذر میں وہ بھی شاخوں کے تلے
لے گئی مجھ کو وہ آخر ایک گہرے غار میں
میں نے سمجھا آگیا ہوں اب کسی گلزار میں
لائی کچھ پھل پھول وہ مجھ کو کھلانے کے لیے
چار بوسے بھی دیے اپنا بنانے کے لیے
تھپکیاں دے کر وہ مجھ پہ پیار برسانے لگی
میری قسمت جاگ اُٹھی مجھ کو نیند آنے لگی
نیند آتے ہی مِرا جاگا مقدّر سو گیا
ہائے کیا سوچا تھا میں نے اَور یہ کیا ہو گیا
نیند میں جو خواب دیکھا مجھ کو اب تک یاد ہے
خواب ہی کی یاد سے صبر و سکوں برباد ہے
مَیں نے دیکھے قید میں سہمے ہوئے کچھ بادشاہ
زرد چہرے تھے مگر تھا سب کے لب پر انتباہ
یک زباں ہو کر وہ بولے "اے سپاہی ہوشیار
ہو چکا ہے تُو بھی اس بے رحم لڑکی کا شکار"

اُن کی یہ تقریر میری رُوح برمانے لگی
خواب میں دیکھی ہوئی تصویر ٹر پانے لگی
نیند آخر اُڑ گئی صبر و سکوں جاتا رہا
خواب کی دُنیا کا وہ سارا فسوں جاتا رہا
آنکھ کھولی تو وہی میں تھا وہی ویرانہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

احساس

(جان کیٹس کی نظم HAPPY INSENSIBILITY کا ترجمہ)

(۱)

سردیوں کی اس اندھیری رات میں
اے خوش و خُرّم درخت!
تیری شاخوں کو نہیں احساس کچُھ
عہدِ رفتہ کی بہاریں کیا ہُوئیں!
موسمِ سرما کی تیز و تر ہوا
تیرا کچُھ نقصان کر سکتی نہیں
برف و باراں کر نہیں سکتے تجُھے غم سے نڈھال
دُھوپ چھاؤں سے تجھے ہوتا نہیں ہرگز ملال!

(۲)

سردیوں کی اس اندھیری رات میں
مستِ راحت جوئبار!
تیرے پانی کو نہیں احساس کچھ
عہدِ رفتہ کی روانی کیا ہوئی
بھول جاتے ہیں تجھے ماضی کے دِن
تیرے دِل کو آہ! کچھ ہوتا نہیں
شب کی تاریکی میں تیری رُوح گھبراتی نہیں
تُجھ کو رہ رہ کر کسی کی یاد تڑپاتی نہیں!

(۳)

زندگی کی اِس اندھیری رات میں
کاش انساں کو بھی مِل جاتا قرار
آہ! ہم نے آج تک کوئی بشر دیکھا نہیں
جس کا سینہ رنج و غم سے ہو نہ جائے داغ دار
زندگی کی دھوپ چھاؤں میں جو یکساں رہ سکے
رنج و غم درد و الم کو جو خوشی سے سہہ سکے
جس کا دِل قابُو میں ہو، بیگانۂ احساس ہو
حسرتوں سے بے خبر، نا آشنائے یاس ہو!

بُلبُل سے خطاب

یہ نظم کیٹس نے ۱۸۱۹ء کے آغاز میں لکھی جب وہ اپنے دوست براؤن کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا۔ براؤن کے گھر کے پاس صحنِ چمن میں ایک بُلبل نے اپنا آشیانہ بنالیا تھا۔ اور ایک صبح کو اسی بُلبُل کے وجد آور نغموں سے مسحور ہوکر کیٹس نے یہ لا جواب نظم کہہ ڈالی۔ یہ نظم شاعر کے اپنے حالاتِ زندگی کی آئینہ دار ہے۔ کچھ دن پہلے اُس کا چھوٹا بھائی ٹام تپ دق کا شکار ہوچکا تھا۔ نظم کے تیسرے بند میں شاعر نے اپنے برادر عزیز کی مرگِ ناگہانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُن دنوں وہ کئی قسم کی پریشانیوں سے گِھرا ہوا تھا لہٰذا اس نظم میں افسردگی اور حُزنیت کا عنصر نمایاں ہے۔ بُلبُل کے شیریں نغمات سُن کر کیٹس اس کی صحبت میں کھو جانا چاہتا ہے اور اس طرح دُنیا کی تلخ حقیقتوں سے فرار ڈھونڈتا ہے نظم میں شروع سے آخر تک بُلبُل کی پُرنشاط زندگی اور انسان کی تیرہ بختی کے درمیان تضاد موجود ہے۔

(بہار)

(کیٹس کی مشہور نظم ODE TO NIGHTINGALE کا ترجمہ)

(۱)

درد سا اُٹھا کچھ ایسا چھا گیا مجھ پر خمار
جیسے گانجے کا نشہ ہو میری نس نس پر سوار
جیسے گُم سُم کوئی ہو جائے چڑھا کر ایک جام
یا کوئی افیون کھا کر بھول جائے سارے کام
مَیں ترا حاسد نہیں اے بُلبُلِ شیریں نوا
بلکہ تیری ہمنوائی پر ہے مائل دِل مرا
کوئی جنگل کی پری تجھ کو کہوں یا عندلیب
کاش اُڑ کر مَیں پہنچ جاؤں ذرا تیرے قریب
آڑوؤں کے پیڑ پر تُو زمزمہ پرداز ہے
کس قدر تیری سُریلی رس بھری آواز ہے!

(۲)

اُس مئے کُہنہ سے جو برسوں رہی زیرِ زمیں
کوئی لادے مجھ کو بھر کر ایک جامِ آتشیں
جس کو پی کر یاد آئے گاؤں کے اشجار کی
رقص کی، نغموں کی، دیہاتی گُل و گلزار کی

کوثر و تسنیم سے لے آؤ بھر کر ایک جام
میرے ہونٹوں سے لگا دو میں بہت ہوں تشنہ کام
ہاں وہ جامِ آتشیں اُٹھتے ہوں جس سے بُلبلے
جو لبوں کے ساتھ میرے دِل کو بھی رنگیں کرے
جس کو پی کر بے نیازِ این و آں ہو جاؤں میں
بُلبُلِ شوریدہ کے نغمات میں کھو جاؤں میں!

(۳)

جی میں آتا ہے جہانِ رنگ کو چھوڑ دوں
اَے مِری محبوب بُلبُل! ہمنوا تیرا بنوں
کیا خبر تجھ کو کہ ہے کیسی بشر کی زندگی
نالہ و شیون میں کٹ جاتی ہے ساری زندگی
زندگی میں ٹھوکریں ہیں، ذِلّتیں، رسوائیاں
حادثے وہ جن کو سہ کر مُنھ سے نکلے الاماں!
زندگی سیلِ بَلا ہے، دہر آہوں کا مقام
دِل میں سب کے داغِ حسرت آرزوئیں ناتمام
اِس قدر دشواریوں کی تاب لا سکتا ہے کون
جو بنا دیں دم پہ وہ صدمے اُٹھا سکتا ہے کون
گھیر لیتی ہیں جوانی میں کئی بیماریاں
آہ کیا مجبوریاں ہیں، آہ کیا ناچاریاں!

سوچنے سے اور بھی انسان ہوتا ہے ملوُل
سوچنا بے فائدہ ہے، فکرِ انسانی فضول
چار دن کی چاندنی ہیں حُسن کی رعنائیاں
عشق بھی دِل میں ہمیشہ رہ نہیں سکتا جواں!

(۴)

اُڑ کے تیرے پاس ہی اے عندلیب آجاؤں گا
مُجھ کو مَے سے کیا تعلّق، جام سے کیا واسطا
جب مِرا مُرغِ تخیّل مائلِ پرواز ہے
عقل گو نادان بن کر حائلِ پرواز ہے
پھر بھی تیرے پاس آپہنچا ہُوں اے شوریدہ سر
چاند رانی بھی سجی بیٹھی ہے اَوجِ تخت پر
اِس کے گرد و پیش صف بستہ ہیں اس کی داسیاں
چاند تاروں کی ضیا گو آ نہیں سکتی یہاں
ساتھ لاتے ہیں کبھی جھونکے ہَوا کے روشنی
پیڑ کے پتّوں سے پھر پڑتی ہے چھَن کر چاندنی

(۵)

جلوہٴ گُل پر بھی اب پڑتی نہیں میری نظر
اِن کے رنگ و بُو سے اب میں ہو چلا ہُوں بے خبر

اس مہکتے سائے میں کرتا ہوں یہ دل میں قیاس
کون سے پھولوں کی خوشبو اڑ رہی ہے آس پاس
جس سے ہر نخلِ چمن، برگِ شجر مخمور ہے
جس کی لپٹوں سے یہ سارا بوستاں معمور ہے
نیلوفر کے پھول شاید کھِل رہے ہیں جابجا
زینتِ بستاں ہیں نرگس، نسترن اور موتیا
سب سے دل کش اور خوشبو دار ہے شاید گلاب
شہد کی مکھّی جہاں سے چوس لیتی ہے شراب!

(۶)

مَیں ہمہ تن گوش ہوں اے بلبلِ شیریں نوا
مَیں نے اکثر موت کو سمجھا ہے اپنا آسرا
موت کو دیتا رہا ہوں مَیں صدائیں بار بار
چپکے چپکے کاش ہو جائے وہ مجھ سے ہمکنار
موت پہلے سے کہیں دل کش نظر آتی ہے آج
موت ہو سکتی ہے سب امراضِ ہستی کا علاج
بیٹھے بیٹھے میں یہیں مر جاؤں تو گاتی رہے
جانفزا نغموں کی بارش مجھ پہ برساتی رہے
میرے مرجانے پہ تو جی بھر کے روتی جائے گی
میرے کانوں کی سماعت ختم ہوتی جائے گی!

(۷)

میری بُلبُل! موت تیرے پاس آسکتی نہیں
نسلِ آدم تیری ہستی کو مٹا سکتی نہیں
آج شب کو میرے کانوں میں جو آتی ہے صدا
عہدِ ماضی میں اِسے سُنتے رہے شاہ و گدا
مَیں سمجھتا ہوں اِسی بُلبُل کی وہ آواز تھی
جو کسی فُرقت کی ماری کو تسلّی دے گئی[1]
جب وہ کھیتوں میں کھڑی تھی چھوڑ کر صبر و قرار
یادِ گھر کی ڈس رہی تھی رو رہی تھی زار زار
یا اِسی آواز سے خوش ہو گئی اِک بدنصیب
قید میں بیٹھی تھی جو تنہا دریچے کے قریب!

(۸)

ایک گھنٹی کی صدا تھی لفظ یہ "تنہا" نہ تھا
میرے حالِ زار پر مُجھ کو جو واپس لے گیا
مَیں نے ڈھونڈا تھا تخیّل کا سہارا ابھی فضول
ایک دھوکا تھا فقط جو کر لیا میں نے قبول

---

[1] رُوتھ نامی ایک لڑکی کی طرف تلمیح ہے جس کا ذکر بائیبل میں آتا ہے۔

لو اُڑی جاتی ہے بُلبُل الوداع اب الوداع
کھیت کے اُس پار جا پہنچا ہے وہ کیفِ سماع
اب کہاں وہ مدھ بھری آوازِ اِس گلزار میں
کھو گئی ہے اب کہیں وہ دامنِ کُہسار میں
یہ حقیقت تھی مرے اللہ یا اک خواب تھا
اُڑ گئی بُلبُل کہیں سُویا ہوں میں یا جاگتا!

آرام طلب

ٹرائے کی جنگِ عظیم کے بعد جب یونانی سپہ سالار یُولیسز اپنے مُٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ اپنے وطن کو لوٹتا ہے تو رستے میں اُسے کئی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کافی مُدت گھُومتے پھرنے کے بعد ایک دن جب اُن کا جہاز ایک جزیرے پر جا کر رُکتا ہے تو یُولیسز کے ساتھی وہاں کے باشندوں سے مل کر وہیں کے ہو رہتے ہیں اور اپنے لیڈر کے ساتھ آگے جانے سے اِنکار کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں کے باشندوں نے اِن ملاّحوں کو لوٹس نام کا پھُول کھانے کے لیے دیا جسے چکھتے ہی اُن پہ کاہلی اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور یہ لوگ آرام پرست بن جاتے ہیں۔ اِس کیفیت میں وہ اِسی وادیٔ دل کش میں لیٹ کر ایک گیت گاتے ہیں جس کے ذریعے وہ ہر قسم کی دوڑ دھُوپ اور گردشِ پیہم سے نفرت اور بے زاری کا اظہار کرتے ہیں نظم "آرام طلب" اِن ملاّحوں کے اِسی گیت کا ترجمہ ہے۔ (مترجم)

(ٹینی سن کی مشہور نظم LOTUS EATERS سے ماخوذ)

(۱)

دُنیا کی ہر اک چیز کو مِل جاتا ہے آرام
اِنسان کی قسمت میں ہے دن رات مگر کام
ہر چیز کو جب ہوتا ہے آرام میسّر
انسان پریشان ہی کیوں رہتا ہے اکثر
ہم اشرفِ مخلوق ہیں ممتاز ہیں سب سے
کھاتے ہیں مگر روز حوادث کے تھپیڑے
ہر روز نئے رنج ہیں ارمان نئے ہیں
انسان کی تخریب کے سامان نئے ہیں
دم بھر کے لیے گردشِ ایّام ٹھہر جائے
ہر صُبح ٹھہر جائے ہر اِک شام ٹھہر جائے
ہم نیند کی آغوش میں دم لے نہیں سکتے
آرام کا اِک سانس بھی ہم لے نہیں سکتے
آرام بھی انسان کو لازم ہے کبھی تو
ہم اشرفِ مخلوق ہیں یہ بات نہ بھُولو!

(۲)

دیکھو تو ذرا صحنِ گُلستاں کا تماشا
کونپل میں بھی ہوتا ہے اثر بادِ صبا کا
پتّے سے بھی کرتی ہے وہی بادِ صبا پیار
پتّے کے مقدّر میں نہ آلام نہ افکار
دن کو تو وہ سُورج کی شعاعوں میں نہائے
پھر چاندنی شبنم کا اسے دُودھ پلائے
گِر جائے گا جب شاخ سے مُرجھا کے زمیں پر
لے جائے گی پھر بادِ صبا ساتھ اُڑا کر
ہر سیب میں ہم کو نظر آتی ہے یہی بات
پک جانے پہ گِر جائے گا چُپکے سے کسی رات
دیکھے کوئی ہر پھُول کی ہستی کا تماشا
کِھل جاتا ہے، مُرجھاتا ہے کچھ فکر نہ پروا
کُچھ کام مشقّت سے نہ آرام سے کچھ کام
بخشا ہے مشیّت نے ہر اک چیز کو آرام!

(۳)

اِس گنبدِ افلاک کے چکّر میں نہ آؤ
اِس قلزمِ ذخّار میں ڈُبکی نہ لگاؤ

انسان کی ہستی کا ہے جب موت ہی انجام
پھر کس لیے سب کاوشیں، کِس کام کا پھر کام
ہم وقت کی رفتار کو ٹھیرا نہیں سکتے
گُذرے ہوئے لمحات کو پھر لا نہیں سکتے
کیا جانے کہ آجائے گا کب موت کا پیغام
بہتر ہے کہ آرام کریں چھوڑ کے سب کام
وہ کون سی شے ہے جسے دُنیا میں بقا ہے
پھر جہدِ مُسلسل کا یہاں خاک مزا ہے
اِس جہدِ مُسلسل میں سُکوں مل نہیں سکتا
دُنیا میں ہیں سب عیب تو ہم اِس میں کریں کیا
آلام کی یلغار سے دل ٹُوٹ گیا ہے
کُچھ لُطف ہے جینے میں نہ مرنے میں مزا ہے
اِس وادیٔ پُرکیف میں آرام سے سو جائیں
ہم چھوڑ کے گھر بار اِسی دیس کے ہو جائیں!

.. ..

(۴)

خوش رنگ کنول دیکھئے ہر سمت کِھلا ہے
اِس وادیٔ رنگیں کی فضا ہوش رُبا ہے
ہر وقت یہاں چلتی ہیں جاں بخش ہوائیں
اِس وادیٔ شاداب کو کیوں چھوڑ کے جائیں

ہم گردشِ پیہم کا مزا دیکھ چُکے ہیں
ہم پیشِ نظر اپنی قضا دیکھ چُکے ہیں
ہم بحر کے گردابِ بلا دیکھ چُکے ہیں
ہم حشر کے طوفان بپا دیکھ چُکے ہیں

اے ساتھیو! ہم آج قسم کھا کے کہیں گے
تا حشر اِسی وادیٔ دل کش میں رہیں گے
آرام کریں گے اِسی سرسبز زمیں پر
بل آئے ہی کیوں شورِ حوادث سے جبیں پر

رہتے ہیں ملائک بھی یونہی عرشِ بریں پر
اور بجلیاں برساتے ہیں رفعت سے زمیں پر
ایوان میں لیٹے ہوئے پیتے ہیں وہ دن رات
ہنس دیتے ہیں جب دیکھتے ہیں دہر کے آفات

دُنیا میں کہیں جنگ، کہیں قحط، کہیں آگ
انسان کو امراض کے ڈستے ہیں کہیں ناگ
منجدھار میں انسان کہیں ڈوب رہا ہے
امداد طلب سُوئے فلک دستِ دُعا ہے

ہنستے ہیں ملائک تو ہمیں دیکھ کے ناشاد
افلاک نشینوں کے لیے گیت ہے فریاد
تقدیر کے روندے ہوئے لوگوں کی شکایت
ہے عرش نشینوں کے لیے لغو حکایت

یہ قہر زدہ لوگ جو فریاد کناں ہیں
مظلوم ہیں، پامالِ ستم ہائے زماں ہیں
یہ اہلِ زمیں کرتے ہیں دن رات مشقّت
حصّے میں مگر ان کے نہ دولت ہے نہ راحت
ہو جائے گا جب ختم یہ ہستی کا فسانہ
مِل جائے گا بےچاروں کو دوزخ میں ٹھکانہ
یہ آتشِ دوزخ کی بھی دیکھیں گے اذیّت
باقی ہے ابھی اِن کے لیے یہ بھی مُصیبت
سُنتے ہیں کہ جنّت میں بھی کچھ لوگ رہیں گے
جو راحت و آرام کو لبّیک کہیں گے
آرام میں ہستی کا بڑا راز نہاں ہے
جو بات ہے ساحل پہ وہ موجوں میں کہاں ہے
اِس وادیٔ رنگیں میں بھی جنّت کا مزا ہے
پھولوں کا بچھونا ہے دلآویز فضا ہے
بہتر ہے مشقّت سے تو ہر حال میں آرام
اَے ساتھیو! بھُولے سے بھی جانے کا نہ لو نام!

یُولیسز

یہاں فرض کر لیا گیا ہے کہ یُونانی سُورما اور حُکمراں یُولیسز اپنے وطن واپس پہنچ چکا ہے اور اتھیکا نامی جزیرہ میں نیم خواندہ رعیت پر آرام سے حکومت کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہاں آرام زیادہ ہے اور کام برائے نام۔ لہٰذا اس قسم کی زندگی سے اُسے دلی نفرت ہے اور وہ ایک بار پھر اپنے علم میں مزید اضافہ کرنے کے لیے نئی دُنیا اور نئے کارناموں کی تلاش میں جانے کے لیے بے قرار ہے۔ اس نظم میں یولیسز اپنے پُرانے ساتھیوں کو دوبارہ سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ نظم "یولیسز" کا موڈ ٹینی سن کی پچھلی نظم لوٹس ایٹرز یعنی "آرام طلب" کے بالکل برعکس ہے۔ جہاں پچھلی نظم میں کام سے بے زاری ٹپک رہی ہے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں آرام سے نفرت ظاہر کی گئی ہے اور جد و جہد کی زندگی بسر کرنے کی تلقین ہے۔

(مترجم)

(ٹینی سن کی مشہور نظم ULYSSES کا ترجمہ)

ہاتھ پر یوں ہاتھ دھر کر بیٹھنا اچھا نہیں
شہریاروں کو سنور کر بیٹھنا اچھا نہیں
سال خوردہ زوجہ اس گھر میں مری دمساز ہے
کیا یہی شاہوں کی بُود و باش کا انداز ہے!
ہے رعیّت نیم خواندہ، نیم جاہل، بے ہنر
کب سمجھ سکتی ہے میرے دل کا مقصودِ نظر
چَین سے کب بیٹھنے دے گا مجھے ذوقِ نظر
اب نہ ٹھہروں گا، رہوں گا عُمر بھر گرمِ سفر
یاد آیا میکہ میرے ساتھ تھے میرے رفیق
بحر و بر پر گھومنے والے وہ یارانِ شفیق
ہم نے اکثر برق و باراں کا اُڑایا ہے مذاق
بحر و بر پہ لے گیا ہم کو وفورِ اشتیاق

.. ..

مَیں نے دیکھے ہیں ہزاروں ملک لاکھوں آدمی
خیر مقدم میں کہیں پائی نہیں مَیں نے کمی
اپنی مدّبحر کے بھی دیکھے مَیں نے دار و گیر میں
ایک لذّت تھی نہاں تیغ و سنان و تیر میں

میں اگرچہ واقفِ اسرارِ پنہاں ہو گیا
ہے مگر محراب کی مانند سارا تجربہ
اِک نئی دُنیا نظر آتی ہے اِس محراب سے
میں اِدھر آگے بڑھوں وہ دُور تر ہوتی چلے

زندگی پھیکی ہے بن جائے اگر پیہم سُکوت
سانس لینا ہی نہیں ہوتا ہے جینے کا ثبوت
زندگی اپنے لہو میں کھولنے کا نام ہے
آرزوئے راحتِ دائم خیالِ خام ہے
لذّتِ آسائشِ دُنیائے دُوں کیا چیز ہے
زندگی جہدِ مُسلسل ہے سُکوں کیا چیز ہے
بخش دے ہم کو اگر حق زندگی در زندگی
کام اپنا ختم پھر بھی ہو نہیں سکتا کبھی
اپنی ہستی دارِ فانی میں ہے لیکن چند روز
چند روزہ زندگی میں اور بھی لازم ہے سوز
موت سے پہلے کوئی کارِ نُمایاں کر چلیں
سوزِ دل سے بزمِ دُنیا میں چراغاں کر چلیں
حیف ہے گھر میں اگر میں چین سے بیٹھا رہوں
رُوح کو بہرِ تن آسانی ترستا چھوڑ دوں

جسم کو رکھوں عزیز، آرام سے بیٹھوں یہاں
یہ تغافل جب ہو میری رُوح پر بارِ گراں!

.. ..

وہ ساحل ہے، وہ موجیں ہیں، وہ بحرِ بے کراں
جہاز اب کُوچ کی کرنے لگے تیاریاں
میرے پیارے ہم نواؤ! تم ہو میرے ہم خیال
بحر و بر کی سختیوں سے کب ہُوا ہم کو ملال
سخت جانی میں کبھی تھے دہر میں ہم بے مثال
قوّتِ بازو میں آنے لگ گیا ہے اب زوال
عالمِ پیری میں اب وہ زورِ برنائی کہاں
عُمر ڈھلتی جا رہی ہے، وہ توانائی کہاں
پھر بھی لازم ہے ہمیں کچھ کر کے مرنا چاہیئے
عہدِ پیری میں بھی کچھ تو کام کرنا چاہیئے
پیشتر اس کے کہ گُل ہو جائے شمعِ زندگی
زیب دیتی ہے اسے تابندگی، رخشندگی
دیوتاؤں سے بھی ہم ٹکرا چکے ہیں بار بار
ہم کریں وہ کام جو ہوں باعثِ صد افتخار
وہ سرِ کہسار دیکھو پھیکی پھیکی روشنی
آمدِ شب ہے، بکھرتی جا رہی ہے چاندنی

آ رہی ہیں بحر سے کانوں میں آوازیں نئی
ساتھیو! آؤ کہ ہم ڈھونڈیں کوئی دنیا نئی
صبر و استقلال سے بڑھتے چلو، رُکنا نہیں
سیلِ امواجِ بلا کے سامنے جُھکنا نہیں
مَیں نے ٹھانی ہے کہ جاؤں گا اُفق کے پار بھی
صَرف کر دوں گا اِسی کوشش میں اپنی زندگی

.. ..

گو وہ اپنا زورِ بازو اب نہیں باقی رہا
کانپتے تھے جب ہمارے سامنے ارض و سما
وقت اور تقدیر کی گردش نے مارا ہے ہمیں
گردشِ ایّام اِس پر بھی گوارا ہے ہمیں
اَب بھی پہلو میں وہی اپنا دلِ دیوانہ ہے
لب پہ پیہم جُستجو کا نعرۂ مستانہ ہے
ڈھونڈنے پہ منزلِ مقصودِ دل ہی جائے گی
ہمتِ مردانہ ہر مُشکل پہ قابو پائے گی

ہم سفر

ایک عاشق جس کی محبوبہ نے اُس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے آخری اِلتجا کرتا ہے کہ دونوں گھوڑے پر بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے گھوم آئیں ۔ اُس کی یہ درخواست قبول ہو جاتی ہے ۔ اس آخری سواری کے دوران عاشق کے ذہن میں جو خیالات گھوم رہے ہیں اُن کا اِس نظم میں اظہار کیا گیا ہے ۔ خیال رہے کہ عاشق کے نزدیک مایوسی پھٹکنے تک نہیں پاتی اور نہ ہی وہ اپنی محبوبہ کو بُرا بھلا کہتا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو ایک سیاست داں ، ایک سپاہی ، ایک شاعر ، ایک بُت تراش اور مُغنّی سے زیادہ خوش قسمت تصوّر کرتا ہے ۔ اِس نظم سے ہم ناکامیوں میں ہمّت نہ ہارنے اور تصویر کا روشن پہلو دیکھنے کا سبق سیکھ سکتے ہیں ۔

(مترجم)

(براؤننگ کی مشہور نظم THE LAST RIDE TO GETHER کا ترجمہ)

(۱)

منظور یہی جب ہے تجھے اے جانِ جہاں ہے
جو میرا مقدّر ہے وہ اب مجھ پہ عیاں ہے
ناکام رہا آہ! مرا جذبۂ اُلفت
حِصّے میں مرے آئی ہے محرومی و حسرت
لکّھا ہے جو تقدیر میں وہ ہو کے رہے گا!
اب تک ہے مگر دِل میں وہی تیری محبّت
رہتی ہے مرے سامنے ہر دم تری صُورت
گو وصل کی اُمّید تجھے سونپ چکا ہوں
اِس پر بھی تری یاد کا پابندِ وفا ہوں
کچھ اور بھی کہنا ہے مگر تیری رضا سے
گھوڑے پہ چلیں سیر کا کچھ لُطف تو آئے!

(۲)

یہ سُن کے جبیں جھک گئی اُس شوخ اَدا کی
نظریں بھی جُھکیں جِن میں رعونت تھی بلا کی
دیکھا جو ذرا میری طرف آنکھ اُٹھا کر
کچھ آ ہی گیا رحم مرے حالِ زبوں پر
پُوچھو نہ کچھ اُس وقت دلِ زار کا عالم!

اِتنے میں ہوئی مجھ پہ عنایات کی بارش
منظُور ہوئی میری یہ چھوٹی سی گذارش
اب رخش پہ ہم بیٹھیں گے وہ ہوگی مرے پاس
قُربت سے ہمیں ہوگا محبّت کا بھی احساس
اِس ساعتِ نادر کو میں سمجھوں گا غنیمت
کیا جانے کہ آجائے اِسی روز قیامت!

(۴۳)

پھر بیٹھ گئی میرے ہی گھوڑے پہ وہ طنّاز
پَر لگ گئے دل کو بھی، ہُوا مائلِ پرواز
پھر مجھ کو مِلی میری وہ گُم گشتہ جوانی
ماضی تھا میرے واسطے اب ایک کہانی
جو بیت چُکا میرے لیے بیت چُکا تھا!
کیوں سوچتا یُوں کرتا تو ہوسکتی تھی یہ بات
اب سُود و زیاں کے تھے کہاں دل میں خیالات
یہ کہیے کہ قسمت نے دیا اب تو مرا ساتھ
جاسکتی تھی ورنہ وہ مرا چھوڑ کے بھی ہاتھ
کیا مجھ پہ گذرنی تھی بگڑ جاتا اگر کام
اب رخش پہ بیٹھی ہے مرے ساتھ وہ گلفام

(۴)

مانا کہ ملا جو وہ تمنّا سے ہے کم تر
سب کچھ تو نہیں ہوتا کسی کو بھی میسّر
محبوب کے پہلو میں یہ کیا کم تھی سواری
اُس وقت مری رُوح پہ تھا کیف ساطاری
دُنیا کی ہر اک چیز تھی رقصاں مرے آگے!
سوچا کہ کیا کرتے ہیں سب لوگ رِیاضت
کِتنے ہیں مگر جن کے قدم چُوم لے نُصرت
تکمیل کہاں پاتے ہیں دُنیا میں سبھی کام
آغاز تو آسان ہے دُشوار ہے انجام
سوچا تھا ہمیشہ وہ مِرے پاس رہے گی
اب رخش پہ ہے ساتھ چلو یہ بھی ہے کافی!

(۵)

ہونے کو تو ہوتے ہیں کئی دِل میں عزائم
ہر عزم کی تکمیل کہاں ہوتی ہے دائم
ہو لاکھ کسی کام سے انساں کو لگاوٹ
کِس کام میں آتی نہیں درپیش رُکاوٹ
صد شُکر کہ جی بھر کے اُسے دیکھ رہا ہُوں!

لیڈر کو ذرا دیکھئے کیا ملتا ہے اِنعام
مَرجانے پہ چھپ جائے گا اخبار میں بس نام
جانباز سپاہی کو یہ ہوتا ہے میسّر
کھودے گا پسِ مرگ کوئی نام لحد پر
لیڈر کا ہے یہ حال، سپاہی کا یہ انجام
مَیں خوش ہوں کہ دونوں سے ہے بڑھ کر مرا انعام!

(۶)

اے قُلزمِ افکار میں ڈوبے ہوئے شاعر!
الفاظ سے تُو شعر بنانے میں ہے ماہر
ہے تیرا قلم حُسنِ جہاں تاب کا مَظہر
دے سکتا ہے جذبات کو الفاظ کا پیکر
بھر دیتا ہے الفاظ کے پیکر میں ترنُّم
مانا کہ بڑی چیز ہے یہ کام ہے مُشکل
کیا خود بھی مگر تُجھ کو ہے نعمت کوئی حاصِل
جُز عُسرت و ادبار ترے پاس ہی کیا ہے
کیا تشنہ لبی ہی تری کاوش کا صِلا ہے
یہ مان لیا ذوقِ سخن سے ہُوں مَیں عاری
لیکن تِری قسمت میں کہاں ایسی سواری!

(۷)

بُت گر سے کہو تُو نے بھی کی فن کی عبادت
رکھتا ہے فنِ سنگ تراشی میں مہارت
وِینس کا یہ بُت جس کو سمجھتا ہے تُو شہکار
رکھتا ہے کششِ اِس سے تو بڑھ کر وہ طرحدار
اِس پہ بھی ہے تُو شاد تو کیوں مُجھ کو ہو افسوس!

اے ماہرِ موسیقی! ذرا تجھ سے کروں بات
اِس فن کی عبادت میں ہوئی وقف تری ذات
افسوس کہ بس اِتنی ہی ملتی ہے تجھے داد
"کر سکتا ہے تُو ساز کی جھنکار سے دِل شاد"
اِس پہ بھی یہ مُشکل کہ بدل جاتے ہیں معیار
ہے عشق کا یہ فیض کہ ہم دوش ہے دِلدار!

(۸)

کیا ٹھیک ہے انساں کے لیے اُس کو خبر کیا!
منظُور اگر کاتبِ تقدیر کو ہوتا
ہو جاتی یہیں وصل کی نعمت بھی میسّر
لیکن کوئی نا عاقبت اندیش ہو کیوں کر
انسان کو اندیشۂ عقبیٰ بھی ہے لازم!

ہو جاتا اگر زیست میں پورا میرا منشا
مِل جاتی یہیں مجھ کو مِری جانِ تمنّا
عُقبیٰ کے لیے پھر کوئی رہتا نہ سہارا
صد شُکر کہ کشتی سے رہا دُور کنارا
ہو لینے دو اب رخش پہ دم بھر مجھے محظوظ
محبُوب بھی محفوظ ہے عُقبیٰ بھی ہے محفوظ!

(۹)

خاموش تھی وہ رشکِ قمر، غیرتِ فردوس
ماحول تھا میرے لیے ہم صورتِ فردوس
وہ ماہ لقا مجھ سے تھی اُس وقت بغل گیر
ایسی ہی ہُوا کرتی ہے فردوس کی تصویر
مُمکن ہے کہ بن جائیں یہ لمحات دوامی!
بیٹھے ہی رہیں رخش پہ تا روزِ قیامت
ہر وقت رہے سامنے وہ چاند سی صُورت
ارماں بھی نکلتے رہیں حسرت بھی ہو باقی
بن جائے گا فردوس یہی عالمِ خاکی
ہو گی نہ کبھی ختم یہ پُر لُطف سواری
جنّت بھی ہماری ہے، یہ دُنیا بھی ہماری!

فریبِ نظر

(آرنلڈ کی مشہور نظم DOVER BEACH کے آخری بند کا ترجمہ)

جہاں میں پہلا سا حُسنِ یقیں نہیں ملتا
وہ ذوقِ دید، وہ جذبہ کہیں نہیں ملتا
سرائے دہر ہے رنج و ملال کی دُنیا
طلسمِ وہم کی خواب و خیال کی دُنیا
یہ دیکھنے کو تو بے شک حسین و زیبا ہے
مگر یہ حُسن فریبِ نظر ہے، دھوکا ہے
یہاں کوئی بھی ہمیں شادماں نہیں ملتا
سکونِ قلب و جگر کا نشاں نہیں ملتا
کسی کے دِل میں محبت نہیں کسی کے لیے
کہیں چراغ نہیں جلتے روشنی کے لیے
یہ رنج و غم کی ہے وادی، الم کی دُنیا ہے
یہاں نہ دُکھ کا مداوا، نہ غم کا چارا ہے
کسی بشر کو کسی پر بھی اعتبار نہیں
کوئی کسی کا حقیقت میں غم گُسار نہیں
سمجھ تو کم ہے مگر اس طرح جھگڑتے ہیں
اندھیری رات میں جیسے سپاہی لڑتے ہیں

بے خودی

(سروجنی نیڈو کی نظم ECSTASY کا ترجمہ)

(۱)

اُٹھو بہار آگئی
چمن میں مرغزار میں،
وہ عندلیبِ خوشنوا خوشی سے گا رہی ہے آج
وہ جو ئبار کس طرح مچل کے آ رہی ہے آج
وہ مور بھی تو دیکھئے جو محوِ رقص و رنگ ہیں!

(۲)

دلِ حزیں نظر تو کر — سماں ہے رقص و رنگ کا
مٹائے جا رہا ہے غم — اثر صدائے چنگ کا
سماں تو دیکھ ہر طرف — بہار ہی بہار ہے
عروسِ کائنات پر — شباب ہے نکھار ہے
طیور نغمہ سنج ہیں — طرب میں جوئبار ہے
انھیں سے لیں گے درس ہم سرور و انبساط کا
غم و الم کے واسطے تو ایک عمر ہے ابھی
یہ ذکر غم کا چھوڑ دے
کہ آج نو بہار ہے

نوٹ (انگریزی میں شعر کہنے والے کسی ایشیائی شاعر کی صرف یہی ایک نظم "نسیم مغرب" میں شامل کی گئی ہے۔ بہار)

مختصر تذکرۂ شعراء

صفحاتِ آئندہ میں اُن شُعراء کے حالاتِ زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی نظمیں "نسیمِ مغرب" میں شامل ہیں۔

(بہآر)

جان ہنری نیومین

ولادت ۱۸۰۱ء — وفات ۱۸۹۰ء

جان ہنری نیومین کی پیدائش ۱۸۰۱ء میں ہوئی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اوریل کالج کا فیلو منتخب ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں اٹلی کا سفر کیا اور اٹلی سے واپسی پہ اس نے اپنی مشہور "مناجات" لکھی اور کئی دین دارانہ تبلیغی پمفلٹ قلم بند کیے۔ رفتہ رفتہ اس کا رجحان رومن کیتھولزم کی طرف ہونے لگا اور ۱۸۴۳ء میں انگلستان کے کلیسا کو خیرباد کہہ کر وہ رومن کیتھولک بن گیا۔

نیومین نے اپنا پہلا ناول "سود و زیاں" ۱۸۴۸ء میں سپردِ قلم کیا۔ اس کتاب میں اس نے ایک افسانے کی صورت میں اپنی تبدیلیٔ عقائد کی کہانی بیان کی ہے نیومین نے یونیورسٹی تعلیم کی ماہیت اور وسعت پہ چند لیکچر دیے جو بعد ازاں "یونیورسٹی کا تصور" نامی ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیے گئے۔ "ایک شریف النفس کی تعریف" کا انہی لیکچروں میں مذکور آتا ہے۔ ۱۸۵۴ء میں نیومین کا دوسرا ناول "کیلِسٹا" شائع ہوا جو کہ تیسری قرن کے ایک عیسائی ہیرو کی داستان ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی خود نوشت سوانح عمری تھی، جس کی اشاعت ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ یہ کتاب مصنف کے روحانی ارتقا کی موثر پیرایہ میں عکاسی کرتی ہے۔ اور اس کا طرزِ بیان بھی نہایت جاذبِ نظر ہے۔ "معذرت نامہ" نیومین کی مقبول ترین تصنیف ہے، جو اس کی تمام خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ۱۸۹۰ء

میں وہ عالمِ فانی سے مُلکِ عدم کو روانہ ہو گیا۔

نیومین کی قلم میں جادو ہے۔ اُس کی طرزِ تحریر میں شستگی، پاکیزگی، لطافت اور لوچ ہے۔ وہ فنِ خطابت کا بھی ماہر ہے لیکن اُس کے خطیبانہ انداز میں تصنّع نام کو بھی نہیں ہے بلکہ اُس کے ایک ایک لفظ سے اُس کی پُر خلوص شخصیت جھلک رہی ہے۔ وارداتِ قلبی اور کشاکش ہائے دروں کو صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان کرنے میں اُسے کمال حاصل ہے اُنیسویں صدی میں انگلستان میں شاید ہی کوئی دُوسرا مصنّف پیدا ہُوا ہو جس نے مذہبی مسائل کی باریکیوں اور اصطلاحات کو اس قدر لطیف، موثر اور خُوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہو۔

ولیم شیکسپیر

ولادت ۱۵۶۴ء — وفات ۱۶۱۶ء

انگلستان کا یہ عظیم ترین ڈرامہ نویس اور شاعر ۱۵۶۴ء میں سٹرٹیفورڈ آیوان کے مقام پر پیدا ہوا۔ اِس کا والد ایک سوداگر تھا۔ شیکسپیر نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک گرامر کے اسکول میں حاصل کی۔ ۱۵۸۲ء میں این ہاتھوے کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی۔ شیکسپیر کی بیوی اُس سے عمر میں آٹھ سال بڑی تھی۔ ۱۵۸۶ء میں وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر لندن میں جا مقیم ہُوا۔ وہاں جاکر وہ ایک تھیٹر میں شامل ہو گیا اور کئی ڈراموں میں ایکٹر کے طور پہ کام کیا۔ جلد ہی اس نے اپنے ڈرامے لکھنے شروع کر دیے اور اس میدان میں بے حد کامیابی حاصل کی۔ شیکسپیر نے کل سینتیس ۳۷ ڈرامے لکھے۔ جن میں سے کچھ تاریخی، کچھ طربیہ اور کچھ المیہ ہیں۔ اُس کا سب سے بڑا تاریخی ڈرامہ "ہنری پنجم" تھا۔ طربیہ ڈراموں میں سے "بات کا بتنگڑ"۔ "آپ جیسے چاہیں" اور "بارہویں رات" خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن شیکسپیر کی عظمت المیہ ڈراموں پر مبنی ہے۔ ان میں سے ہیملٹ۔ اوتھیلو۔ بادشاہ لیئر اور میکبتھ شاہکار تصوّر کیے جاتے ہیں۔ ۱۶۱۱ء میں وہ اپنے وطن مالوف کو واپس چلا گیا اور ۲۳ر اپریل ۱۶۱۶ء کو یہیں پہ وفات پائی۔

شیکسپیر کو عموماً ایک لاثانی ڈرامہ نویس کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے مگر علاوہ ازیں وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا شیکسپیر کے بہترین اشعار کی جھلک

اُس کے ڈراموں میں ملتی ہے مگر ان اشعار کے علاوہ اُس نے دو بیانیہ بھی قلمبند کیں اور ۱۵۴ سانٹ لکھے۔ یہ سانٹ بیشتر خود گذشت پر مبنی ہیں اور اُس کے مُربّی اور محبُوب دوست ارل آف ساؤتھیمپٹن کے نام منسوب ہیں۔ ایسی نظموں میں اُس نے زیادہ تر اپنے خوش وضع دوست کے حُسن کی تعریف کی ہے اور کہیں کہیں اُسے کچھ کار آمد مشورے دیے ہیں۔ باقی نظموں میں اس نے ایک سیاہ فام خاتون سے کچھ دل کی باتیں کہی ہیں۔

اس بات پر نقّاد متفق ہیں کہ دنیا بھر کے ادب میں شیکسپیئر کا مقام افضل ترین ہے۔ اُس کی ہمہ گیری ایک مُسلّمہ امر ہے۔ اُس کے ڈراموں میں ہر عہد ہر مقام ہر عُمر اور ہر مذاق کے اشخاص کے لیے مواد موجود ہے۔ ڈرامے کی ہر صنف پر اُسے قُدرت حاصل ہے۔ شاعری میں زبان پر غضب کا عبور رکھتا ہے۔ موزوں الفاظ یُوں آسانی سے اور قُدرتی طور پر اُس کی نوکِ قلم پر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ شیکسپیئر کے بے شمار اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں اور غالب کے اشعار کی طرح ہر موقع پر کام آتے ہیں۔ اِس کی تحریر میں روانی اور مٹھاس ہے۔ مضمون آفرینی اور بذلہ سنجی اُس کی بُوقلموں طبیعت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہیں۔ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں تشبیہوں اور استعاروں میں نُدرت اور تنوّع پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی مناسبت تخیّل کی رفعت، نکات کی برجستگی، بیان کی صفائی، معنی آفرینی، نازک خیالی، شوخی و ظرافت، فلسفیانہ رنگ، الغرض وہ کون سی خوبی ہے جو اس شہنشاہِ اقلیمِ سخن کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ایسے قادر الکلام شاعر اور ڈرامہ نویس کا جواب آج تک دنیا کی کوئی زبان نہیں پیش کر سکی۔

جان مِلٹن

ولادت ۱۶۰۸ء — وفات ۱۶۷۴ء

جان مِلٹن ۹ ر دسمبر ۱۶۰۸ء کو بمقام لندن پیدا ہُوا۔ اُس کے والد بزرگوار دین دار اور حق پرست انسان تھے۔ ریاضت اور زُہد و تقویٰ سے بیحد دلچسپی رکھنے کے باوجود علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ اور سنگیت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے چنانچہ مِلٹن کو یہ تمام خصوصیات ورثہ میں ملیں۔ اُسے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ خود لکھتا ہے کہ بارہ سال کی عُمر کے بعد نصف شب گذر جانے سے پہلے کبھی نہیں سوتا تھا اور کتابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔ اس طرح ایامِ طفولیت ہی میں اُس نے یُونانی لاطینی اور دُوسری کئی زبانوں میں مہارت حاصل کرلی۔ ۱۶ برس کی عُمر میں کیمبرج یونیورسٹی داخل ہوا۔ اور یہاں سے ۱۶۳۲ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ہونہار بروا کے چِکنے چِکنے پات۔ اقبال کی طرح مِلٹن نے بھی طالب علمی کے زمانے میں معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں۔ اوّل الذکر کی مشہور نظم "کوہ ہمالہ سے خطاب" کی طرح مِلٹن کی شہرہ آفاق نظم "میلادِ مسیح" بھی انھیں دنوں کی دماغی پیداوار ہے۔ تحصیلِ علم سے فارغ ہو جانے کے بعد مِلٹن لندن کے ایک نواحی گاؤں ہارٹن میں چلا گیا اور یہاں پر قُدرت کے دلآویز اور پُرسکون مناظر میں زندگی کے پانچ برس گذار دیے۔ اِسی قیام کے دوران اُس کے دل میں یہ زبردست جذبہ پیدا ہُوا کہ وہ دُنیا میں ایک ایسی تصنیف چھوڑ جائے جو لافانی ہو۔ یہ دور

نہ صرف ایک عظیم شاعر بننے کی تیاری میں بسر ہوا بلکہ تخلیقی اعتبار سے بھی اہم تھا۔ "مردِ مسرور" ، "مردِ رنجور" جیسی غنائی نظمیں ، "لیسی ڈاس" ایک لافانی مرثیہ اور ایک ناٹک بعنوان "کامس" اسی دَورِ کی یادگار ہیں۔

سنہ ۱۶۳۸ء میں ملٹن یورپ کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ فرانس جانے کے بعد اٹلی پہنچا۔ جب وہ اٹلی میں مقیم تھا تو مادرِ وطن میں خانہ جنگی کی خبر اس کے کانوں تک پہنچی۔ "حق و باطل" کی اس جنگ میں حصّہ لینا اپنا اخلاقی فرض تصوّر کرتے ہوئے وہ انگلستان کو واپس لوٹا۔ سنہ ۱۶۴۰ء سے سنہ ۱۶۶۰ء تک ملٹن نزاعی تصانیف میں منہمک رہا۔ اپنے قلم کے زور سے پارلیمنٹ کے مفاد کو تقویت پہنچانے اور مطلق العنان حکومت کی دھجیاں اُڑانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کام کی زیادتی کے باعث سنہ ۱۶۵۲ء میں ملٹن بصارت کھو بیٹھا۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں شاہی حکومت بحال ہو جانے پر ملٹن کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ان مشکلات کی طرف اُس نے اپنی مشہور تصنیف "بہشت کھو گیا" میں کئی جگہوں پر اشارے کیے ہیں۔

ملٹن کی زندگی میں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اُس کی بہترین نظمیں "بہشت کھو گیا" اور "بہشت دوبارہ مل گیا" شاعر کے نابینا ہو جانے کے بعد معرضِ وجود میں آئیں۔ اوّل الذکر نظم جو کہ بارہ حصّوں میں منقسم ہے دُنیا کی بہترین رزمیہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ ایک طویل ڈرامائی نظم ہے جس میں اُس نے مشیّتِ ایزدی میں حکمت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۸ نومبر سنہ ۱۶۷۴ء کو ملٹن راہی ملکِ بقا ہو گیا۔

تاریخ ادب میں ملٹن کا نام شیکسپیئر سے دُوسرے درجے پر آتا ہے۔ وہ ایک اخلاقی شاعر تھا اور آغازِ شباب ہی سے اُس پر یہ دُھن سوار تھی کہ اُسے شاعری کے ذریعے ایک پاکیزہ مشن پورا کرنا ہے۔ لہٰذا اُس نے شاعری کو محض تضیعِ اوقات یا دل بہلاوے کا سامان نہیں بنایا۔ اُس کا کلام نہایت پاکیزہ ہے

جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے جو شوکتِ الفاظ ہمیں ملٹن کے کلام میں ملتی ہے وہ بے نظیر ہے۔ وہ ایک عالمانہ شاعر ہے اور اُس کی شاعری تلمیحات سے بھرپور ہے لہٰذا اس کے کلام کو سمجھنا چنداں آسان نہیں۔ ملٹن کے ہاں پابند اور آزاد دونوں قسم کی نظمیں ملتی ہیں مگر آزاد نظم لکھنے میں اُس نے خاص جوہر دکھائے۔

بیسویں صدی میں ملٹن کی شہرت زوال پذیر ہو چکی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اور دیگر کئی جدید ادباء نے ملٹن کی شاعری پر بھرپور وار کیے ہیں اور اُسے انگریزی زبان کو مصنوعی اور غیر قدرتی بنا دینے کا موردِ الزام ٹھیرایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید نقّادوں کے اس نظریہ کے باوجود ملٹن کی شاعرانہ عظمت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا۔

پوپ

ولادت ۱۶۸۸ء - وفات ۱۷۴۴ء

پوپ ۱۶۸۸ء میں بمقام لندن پیدا ہُوا۔ وہ بچپن میں نہایت ہی نحیف اور لاغر تھا۔ وہ کسی سکول میں باقاعدہ طور پر زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ لیکن چُوں کہ کتابوں سے بے حد دلچسپی تھی وہ پرائیویٹ طور پر مطالعہ کرتا رہا۔ رومن کیتھولک گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث اچھی ملازمت ملنے کے امکانات زیادہ نہ تھے لہٰذا اُس نے خدمتِ ادب ہی کو اپنا نصبُ العین بنایا۔ سولہ برس کی عُمر میں اُس نے شبابی نظموں کا ایک مجموعہ نکالا جو ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہُوا۔ ۱۷۱۱ء میں اُس نے قیدِ نظم میں اپنا مشہور "تنقیدی مقالہ" لکھا جس سے اُس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ ۱۷۱۲ء میں اُس کا طنزیہ شاہکار "کاکل کی عصمت دری" منظرِ عام پر آیا۔ جو کہ اُن دِنوں کے ایک حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔ اس معرکۃ الآرا ادبی تخلیق میں اُس نے اپنے وقت کے مصنوعی رسوم و رواج اور خصوصاً خواتین کی سُبک سری اور فیشنوں کا نہایت دلچسپ پیرایہ میں خاکہ اُڑایا ہے۔ رزمیہ انداز کی اِس مضحک نظم کی اشاعت کے بعد پوپ کا نام مُلک کے کونے کونے میں پھیل گیا اور والٹیئر نے اُسے اپنے مُلک بلکہ اپنے عصر کا عظیم ترین شاعر قرار دیا۔

پوپ کی صحت شروع سے خراب تھی، اُسے اپنی والدہ سے دردِ سر اور والد

سے کبڑا جسم ورثہ میں مِلا تھا۔ ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کی مدد کے بغیر لباس زیبِ تن نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اپنے اندرونی جذبۂ دل کے بل بُوتے پر انگریزی ادیبوں کی صفِ اوّل میں اپنا مقام بنا لیا۔ اپنی تصانیف کے ذریعے اُس کو کافی مالی فائدہ بھی ہوا۔ اور اِس آمدنی سے اُس نے دریائے ٹیمز کے کنارے پر اپنا ایک مکان بنا لیا۔ ہومر کی مشہور تصانیف اِلیڈ اور اوڈیسی کے ترجموں سے اُسے نو ہزار پونڈ وصول ہوئے۔ اب اُس کے کئی ادیب دوست اُس سے مُلاقات کے لیے اُس کے مکان پر آنے جانے لگے اور وہاں گھنٹوں خوش گپیاں جاری رہتیں۔ یہاں پر پوپ نے اپنی تضحیک آمیز نظم "کُند ذہن" لکھی جس میں اپنے تنقید چیوں سے انتقام لیا۔ ۱۷۳۳ء میں اُس نے "انسان پر شعری مقالہ" لکھا جس میں فلسفیانہ دلیل بازی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اِس میں فلسفہ عامیانہ قسم کا ہے۔ پوپ ۳۰ مئی ۱۷۴۴ء کو عالمِ جاودانی کو سدھارا۔ اور اپنے مکان ہی کی چار دیواری میں مدفون کیا گیا۔

پوپ نے ایک ایسے دَور میں جنم لیا جب گیت، عشقیہ نظمیں، ڈرامے لکھنے یا مناظرِ فطرت بیان کرنے کا رواج نہ تھا۔ پوپ کی شاعری بھی اپنے عہد کے رسم و رواج کی حدود سے باہر نہ نکل سکی۔ مگر طنزیہ اور اخلاقی شاعری کے محدود دائرے میں پوپ مُسلّم الثّبوت اُستاد مانا گیا۔ اُس کا اثر اپنے عہد کی شاعری پر چھایا رہا اور اُس کے معاصرین فخر کے ساتھ اُس کی تقلید اور پیروی کرتے۔ پوپ کو اپنے وقت کا ولی کہنا ناموزوں نہ ہو گا۔ ملکہ این کے عہد کا شاید ہی کوئی نظریہ، خیال، اعتقاد یا فیشن ہو گا جس کا عکس ہمیں پوپ کی شاعری میں نہ مِلتا ہو۔

پوپ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت طنز اور ظرافت ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی طرح بذلہ سنجی اس کی طبیعت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ زبان نہایت صاف اور طرزِ بیان حد درجہ دل کش ہے۔ پوپ کا کلام عیوبِ شاعری سے

بالکل مبرّا ہے۔ اَسلوُب کے اعتبار سے پوپ نے پابند نظم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اِس مخصوص انداز میں اُس نے ہر بات کو کمال خُوبی اور لطافت سے بیان کیا ہے۔ ایک عامیانہ جذبے یا خیال کو دلپذیر شعری جامہ پہنانا پوپ ہی کا حصّہ ہے۔ اُس نے اپنے کلام میں وہ ہر قسم کی باتیں کہہ ڈالی ہیں جن کو پڑھ کر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے دِل میں بھی عین یہی بات تھی۔ بقولِ غالبؔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

تھامس گرے

ولادت ۱۷۱۶ء - وفات ۱۷۷۱ء

تھامس گرے ۲۶ دسمبر ۱۷۱۶ء کو بمقام لندن پیدا ہوا۔ اس کا باپ عرضی نویس تھا جس کی تُند مزاجی نے اس کی بیوی کو علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بارہ بچّے تھے جن میں سے تھامس گرے کے سوا کوئی بھی جانبر نہ ہوا اور تھامس کی صحت بھی تمام عمر خراب رہی۔

گرے کو حصولِ تعلیم کے لیے ایٹن سکول میں بھیجا گیا جہاں ہوریس وال پول کے ساتھ اُس کی دوستی ہوگئی۔ اُس کو ورزش اور کھیلوں سے مطلق دلچسپی نہیں تھی اور کھیلنے کی بجائے وہ کتابیں پڑھنے میں مُنہمک رہتا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کیمبرج چلا گیا جہاں اُس نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ فطرتاً خلوت پسند اور کم گو تھا اور اکثر متفکر اور دلگیر رہتا۔ چار سال بعد بغیر ڈگری حاصل کیے اُس نے کیمبرج کو خیرباد کہا اور اپنے دوست والپول کے ساتھ یورپ کے سفر کو روانہ ہوگیا۔ والپول سے اختلاف ہو جانے پر وہ ۱۷۴۱ء میں یورپ سے واپس آگیا اور اگلے سال اُس نے اپنی بہترین نظمیں سپردِ قلم کیں۔ اُس کے مشہور "مرثیہ" کی تصنیف کا اسی سال آغاز ہوا۔ ۱۷۴۹ء میں اپنی خالہ میری کی وفات پر وہ دوبارہ اس نظم کی جانب متوجہ ہوا اور یہ ۱۷۵۰ء میں مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ اس سے گرے کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔

۱۷۵۷ء میں اُسے مُلک الشعرا کے منصب کی پیشکش ہوئی۔ مگر گرے نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ ۱۷۶۳ء میں اُسے کیمبرج یونیورسٹی میں تواریخ کے پروفیسر کی آسامی مل گئی مگر وہ گنٹھیا کا مریض تھا اور صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ۲۴ جولائی ۱۷۷۱ء کو وہ یکدم بیمار ہو گیا اور ایک ہفتہ کے بعد ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

گرے نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی۔

کلاسیکی دَور سے رومانوی دَور کے عبوری عہد میں گرے کامل ترین فن کار ہے۔ گرے کے کلام کی مقدار تو زیادہ نہیں ہے لیکن اشعار کی چاشنی، بیان کی خوبصورتی اور موزونیٔ طبع کے باعث انگریزی شعرا کی فہرست میں اُس کا مقام کافی بلند ہے۔ کولرج کی طرح چند دلآویز نظموں کے طُفیل اُس کا نام ادبی دُنیا میں مشہور ہو گیا۔

گرے ایک عالم تھا جو اپنے عہد کے ادبی رُجحانات سے بخوبی واقف تھا۔ اٹھارویں صدی کے کلاسیکی سکول والی ضابطہ پرستی اور صحت اُس کے ہاں پائی جاتی ہے مگر علاوہ ازیں وہ مناظرِ قدرت اور عام انسان سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس طرح اگرچہ اُس کے کلام میں رومانوی رنگ غالب ہے تاہم کلاسیکی عنصر بھی بالکل مفقود نہیں ہے۔ اُس کی شاعری جو اخلاص و صداقت پر مبنی ہے اکثر حقیقی جذبات سے لبریز نظر آتی ہے۔ تاہم جذبات کے ہیجان کی نسبت نفاست زیادہ نمایاں ہے۔ یہ دُرست ہے کہ اُس کا فن سابقہ کلاسیکی سکول کی تصنّع سے مکمل طور پر مبرّا نہیں ہے تاہم اس سکول کی خامیوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ لہٰذا نئی تحریک کے پیشرو رومانوی مصنّفین کے ساتھ ہم عقیدگی میں اس نے چنداں تاخیر نہ کی۔ اس کا ذہن ایک آئینہ ہے جس میں اس عہد کے ہر قسم کے تاثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔

گرے کی نظم ELEGY جس کا ترجمہ قارئین کے سامنے ہے دُنیا بھر کے مقبول ترین مرثیوں میں سے ہے۔

ولیم ورڈز ورتھ

ولادت ۱۷۷۰ء - وفات ۱۸۵۰ء

ولیم ورڈز ورتھ ۷ اپریل ۱۷۷۰ء کو بمقام کاکرماؤتھ پیدا ہوا۔ ایامِ طفولیت ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اُس کے قریبی رشتہ دار اس کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ قدرت کے دلآویز نظاروں سے بھرپور شہر ہاک شید کے ایک سکول میں اُسے حصولِ تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔ یہاں رہ کر اُس نے کتابوں کی نسبت مناظرِ قدرت سے زیادہ سبق سیکھا۔ بچپن کے ان تاثرات کی جھلک اس کی بعد کی تصنیف بنام "تمہید" میں نمایاں ہے۔ سترہ برس کی عمر میں اس کو کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ جان کالج میں بھیجا گیا۔ یہاں سے اُسے ڈگری تو مل گئی لیکن کسی شعبے میں وہ اپنے آپ کو ممیّز نہ کر سکا۔ ۱۷۹۱ء میں فرانس کا رُخ کیا۔ یہاں وہ ایک برس رہا اور فرانسیسی انقلاب سے مکمل ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۱۷۹۵ء میں ایک دوست کی جانب سے جس کی اُس نے قیادت کے دوران عیادت کی تھی مبلغ نوسو پونڈ میراث کی شکل میں ملا۔ اس زرِ کثیر سے وہ فکرِ معیشت سے آزاد ہو کر ادبی خدمات سر انجام دینے لگا۔

۱۷۹۸ء میں اُس نے ایک دُوسرے معاون کولرج کے ساتھ "غنائی نظمیں" نامی ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب کی اشاعت انگریزی شاعری میں رومانوی تحریک کا آغاز تصوّر کی جاتی ہے۔ کچھ دن جرمنی میں قیام کرنے کے بعد ورڈز ورتھ نے اپنی بہن ڈاروتھی کے ساتھ خوبصورت لیک ڈسٹرکٹ

میں سکونت اختیار کر لی۔ اور یہاں ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۸۰۲ء میں میری ہچنسن کے ساتھ اُس کا نکاح ہو گیا۔ اُس کی بیوی نیک خصلت تھی۔ مگر جو لطف شاعر کو اپنے دوست کولرج یا اپنی بہن ڈاروتھی کی ادبی صحبتوں میں ملتا وہ بیوی بھی مُہیا نہ کر سکی۔

ابتدا میں ورڈز ورتھ کی تصانیف کی ذرّہ بھر قدر نہ ہوئی بلکہ بیشتر ادبی جرائد کے مُدیران اور نقادوں نے اُس کی شاعری کا مضحکہ اُڑایا۔ مگر وہ بڑے تحمّل کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا اور بالآخر ایک ایسا وقت آیا جب اُس کی شاعری کے چرچے گھر گھر میں ہونے لگے اور نصرت نے قدم چُومے۔ سدے کی وفات پر ۱۸۴۳ء میں ورڈز ورتھ کو ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ ۱۸۵۰ء میں ۸۰ برس کی عمر میں اس ترجمانِ فطرت کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

انگریزی ادب میں ورڈز ورتھ ایک مجتہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے اٹھارویں صدی کے شعرا کے طرزِ ادا اور فرسودہ موضوعِ سخن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ورڈز ورتھ نے شعری ادب میں رومانوی تحریک کی افتتاح کی اور انگریزی شاعری کو دیرینہ روایات سے آزاد کیا۔ وہ شاعرِ جمہور تھا اور اس بات پر زور دیا کہ غریب دہقانوں، چرواہوں، الغرض عوام کی زندگی شعرا کا موضوعِ سخن ہونا چاہیئے اور شاعری میں جو الفاظ، محاورے اور ترکیبیں استعمال کی جائیں وہ عوام کی روزمرہ کی بول چال سے مختلف نہ ہوں۔ اس طرح اُس نے کہنہ طرزِ سخن کو بدل کر فنِ شاعری کو سہل اور زیادہ کارآمد بنایا۔

ورڈز ورتھ کا کلام نہایت شگفتہ۔ پُرتاثیر۔ جاں بخش اور بصیرت افروز ہے۔ اُس نے مصنوعی شہری زندگی کو نظرانداز کر کے مناظرِ قدرت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قدرت ہمارا بہترین دوست۔ رہنما اور فلسفی ہے اور جو تعلیم ہمیں قدرت سے مل سکتی ہے

وہ دُنیا بھر کی حکیمانہ کتابیں ہمیں نہیں دے سکتیں ۔ اس نے اپنی نظموں میں نہ صرف مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی بلکہ قدرت کے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کیا اور اپنے کلام میں اس بات کی تلقین کی کہ جو لوگ مادرِ قدرت کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں وہ جسمانی نیز رُوحانی طور پر بہتر انسان ہوں گے ۔

ورڈز ورتھ کو اکثر "پیغمبرِ فطرت" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔

لارڈ بائرن

ولادت ۱۷۸۸ء - وفات ۱۸۲۴ء

بائرن ۱۷۸۸ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ اُس کا باپ کیپٹن جان بائرن اپنی بدعنوانیوں کے باعث خاصا بدنام تھا اور اس کی ماں کی طبیعت میں بھی اعتدال کا عنصر قطعاً مفقود تھا۔ لہٰذا بائرن کو بداعتدالی اور تلوّن مزاجی ورثہ میں ملی تھی۔ وہ قدرے لنگڑا ہونے کے باوجود بلا کا حسین اور قبول صورت شخص تھا۔ ہیرو سکول میں طالب علمی کے زمانے میں بائرن نے کھیل کود میں دلچسپی۔ بے باکی اور مردانگی کا ثبوت دیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ اُسے ایک دُور کی رشتہ دار مس چاورتھ سے عشق ہوگیا۔ لیکن اس لڑکی نے جو بائرن سے عمر میں دو سال بڑی تھی بے رُخی دکھائی اور کسی دیگر شخص سے شادی کرلی۔ ۱۸۰۵ء میں جب وہ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخل تو بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں اپنے پاس ایک شکاری کتّے اور ایک ریچھ کا بچہ رکھا ہوا تھا۔ ۱۸۰۷ء میں جب کہ وہ ابھی کیمبرج میں تھا اُس کے کلام کا پہلا مجموعہ "لمحاتِ فرصت" شائع ہوا۔ اس کتاب پر کافی لے دے ہوئی لیکن بائرن نے ایک اور طنزیہ نظم "انگریزی شعرا اور سکاٹ لینڈ کے متبصرین" لکھ کر ان تنقید نگاروں کا مُنہ توڑ جواب دیا۔

۱۸۰۹ء میں بائرن اپنے دوست کے ساتھ پہلی بار یورپ کے دورہ پر

گیا اور خطۂ بحیرۂ روم میں کچھ عرصہ کے لیے گھومتا رہا۔ اس سفر کا ادبی نتیجہ ایک شاندار نظم "چائلڈ ہیرلڈ کی سیاحت" کی شکل میں رونما ہوا۔ یہ ادبی شاہکار بے حد مقبول ہوا اور اس کی اشاعت کے فوراً بعد بائرن کی شہرت کا ڈنکا یورپ بھر میں بجنے لگا۔

۱۸۱۵ء میں بائرن نے این آسابیلا کے ساتھ شادی کر لی لیکن شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی اور ایک سال کے اندر ہی بائرن کی بیوی میکے چلی گئی اور واپس آنے سے انکار کر دیا۔ میاں بیوی کے درمیان اس کشیدگی اور علیحدگی سے عوام میں کافی سنسنی پھیل گئی اور اہلِ وطن بائرن سے بدظن ہو گئے۔ بائرن نے طیش میں آکر ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا اور کبھی واپس نہ آنے کی قسم کھائی۔ اس نے زندگی کے باقی ایام زیادہ تر اٹلی میں گذارے۔ یہاں وہ شیلے کی صحبت سے فیض یاب ہوا اور اس سے کافی رسم و راہ پیدا ہو گئی۔ ان آٹھ سالوں میں ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۱۸۲۳ء میں بائرن یونان چلا گیا اور وہاں پہنچ کر ترکوں کے خلاف جنگِ آزادی میں اہلِ یونان کی حمایت کی۔ یونانیوں نے کھلے دل سے اپنے محسن کا استقبال کیا اور اسے اپنا رہنما تسلیم کیا۔ ۹ / اپریل ۱۸۲۴ء کو بارشوں میں گھوڑے پر سواری کرتے ہوئے اسے بخار ہو گیا جو دس دن کے بعد مہلک ثابت ہوا۔ اور اس طرح سینتیس برس کی عمر میں یہ جوان ہمت شاعرِ انقلاب دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

اپنے ہم عصر رومانوی شعراء میں سے بائرن ہی ایسا خوش نصیب شخص تھا جس کو قیدِ حیات کے دوران ہی بے حد شہرت نصیب ہوئی۔ اس کی بیانیہ نظمیں بالخصوص کامیاب ثابت ہوئیں۔ زورِ بیان بائرن کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بےشک وہ اپنی شاعری میں کوئی گہرا فلسفہ نہیں پیش کرتا اور نہ ہی اس کے اشعار میں وہ ترنم ہے جو ہمیں شیلے کے ہاں ملتا ہے۔ مگر بائرن کے کلام میں روانی اور جوش ہے، تڑپ اور حرارت ہے اور جوش ملیح آبادی کی طرح جذبات کا ایک بے پناہ طوفان ہے۔ ان خوبیوں کے باعث بائرن نوجوان طبقے کا بالخصوص پسندیدہ شاعر ہے۔

شیلے

ولادت ۱۷۹۲ء - وفات ۱۸۲۲ء

شیلے ۱۷۹۲ء میں بمقام فیلڈ پلیس انگلستان کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا وہ نہایت شکیل ہونے کے علاوہ ایک آزاد اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ جاہلانہ رسوم و روایات۔ تحکمانہ دبدبہ اور کسی بھی شکل میں مظالم کا سامنا کرنا وہ اپنا فرض اولیں سمجھتا تھا۔ جب اسے اسکول بھیجا گیا تو ایک سنگدل اور درشت مزاج ہیڈ ماسٹر کے تحت سکول اسے جہنم زار اور زنداں نظر آیا۔ سکول میں بچوں کو کوڑے لگانے کا قبیح رواج اسے بالکل ناپسند تھا۔ سکول کے شریر لڑکے اس سے اکثر چھیڑ خوانی کرتے رہتے۔ شیلے کے نازک مزاج کو یہ زہر آلود فضا کیوں کر پسند آتی۔ ۱۸۰۴ء میں جب اسے آکسفورڈ میں بھیجا گیا تو وہاں بھی اس نے پُر جبر سماجی نظام کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ ان دنوں اس نے ایک مجہول الاسم پمفلٹ بعنوان "ضرورتِ کفر" سپردِ قلم کیا جس کی اشاعت پر حکام سخت برہم ہوئے اور شیلے کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ ادھر گھر میں والدین کے عتاب کا سامنا تھا۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد ۱۸۱۱ء میں ایک سرائے کے مالک کی خوبصورت لڑکی مس ہیریٹ ویسٹ بروک کے ساتھ وہ ایڈن برگ بھاگ گیا۔ اس وقت شیلے کی عمر انیس برس تھی اور اس کی محبوبہ سولہ سال کی تھی۔ یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی اور تین سال کے بعد شیلے کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ میکے واپس

آگئی۔ ۱۸۱۶ء میں اُس نے غرقِ دریا ہو کر خودکشی کر لی۔

شیلے کو بیوی کی موت کا صدمہ تو ضرور پہنچا مگر اس واقعہ کے جلد ہی بعد اُس نے میری گاڈون کے ساتھ جس سے پہلے ہی اُس کو عشق تھا شادی کر لی۔ اس کے پہلے سُسر مسٹر ویسٹ بروک نے عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کروا کے دونوں بچوں کی تربیت اپنے ذمہ لے لی۔ یہ بات شیلے کے لیے باعث آزردگی ہوئی۔ کچھ خرابی صحت کی بنا پر اور کچھ تنگ نظر سماج کے خلاف نفرت کا جذبہ لیے ہوئے شیلے اپنی بیوی کے ساتھ ۱۸۱۸ء میں انگلستان سے اٹلی ہجرت کر گیا۔ اُس کی زندگی کے آخری چار سال بائرن اور لے ہنٹ جیسے احباب کی صحبت میں یہیں گذرے۔ تخلیقی اعتبار سے یہ دور زرخیز ترین تھا اور اسی عرصہ میں اُس نے اپنی بہترین نظمیں لکھیں۔ ۱۸۲۲ء میں ایک دن شیلے اپنے دوست مسٹر ولیم کے ساتھ کشتی میں بیٹھا تھا۔ کشتی طوفان کی زد میں آکر ڈوب گئی اور تیس برس کی عمر میں یہ جواں سال شاعرِ آتش نوا لہروں کی نذر ہو گیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد دونوں کی لاشیں ملیں جنھیں احباب نے سپردِ آتش کر دیا۔

بائرن کی طرح شیلے بھی آزادی کا پروانہ تھا۔ وہ فرانسیسی انقلاب سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ غلامی اور ستم رانی سے اُسے نفرت تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حکومت مذہب اور سماج کے مظالم انسان کی ترقی اور خوشی کے لیے سدِّ راہ ہیں۔ وہ ایک مصلح تھا جو موجودہ گلے سڑے نظام کو تاراج کر کے عہدِ زرّیں لانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا۔ اُس نے بہت سی طویل انقلابی نظمیں لکھیں مثلاً "ملکہ ماب"، "بغاوتِ اسلام"، "یونان"، "اٹلس کی ساحرہ" وغیرہ۔ مگر جس میدان میں شیلے کو ید طولیٰ حاصل ہے وہ اُس کی غنائی شاعری ہے۔ انگریزی ادب میں شیلے کا شمار چوٹی کے غنائی شعراء میں سے ہوتا ہے۔ اُس کا شعور نہایت تیز اور نازک ہے۔ جذباتِ عشق اور حزن و ملال کی تصویر ایسے پُر لطف انداز میں کھینچتا ہے کہ شعر تیر و نشتر بن جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کی انقلابی نظموں میں سُنہری مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے

اور وہ موجودہ سماجی نظام کی بُرائیاں پیش کرنے کے بعد ہمارے سامنے ایک ایسے عہد کی تصویر پیش کرتا ہے۔ جب ظلمت پر اُجالا حاوی ہو جائے گا۔ تاہم شیلے فطرتاً مصوّرِ غم ہے۔ اُس کے اشعار میں درد اور سوز کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ اس کے سینے میں ایک حسّاس، پُرخُلوص اور درد مند دل ہے۔

شیلے کو اکثر "پیغمبرِ عشق" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی غنائی نظمیں رومانوی تحریک کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اس کے کلام میں بے ساختہ پن اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ آورد کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ایک ایک شعر پیکرِ حُسن ہے اور شدّتِ جذبات سے لبریز۔ مترنّم اشعار کہنے میں شیلے کا شاید ہی کوئی ثانی ہو۔ "سکائی لارک سے خطاب"، "بادِ مغرب سے خطاب" اور "بادل سے خطاب" اُس کی غنائی نظموں کے چند خوبصورت نمونے ہیں۔

جان کیٹس

ولادت ۱۷۹۵ء - وفات ۱۸۲۱ء

جان کیٹس ۳۱ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو لندن کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہُوا۔ ۱۸۰۴ء میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۱۱ء میں اُس نے ایک ڈاکٹر سے کام سیکھنا شروع کر دیا۔ ۱۸۱۷ء تک وہ ایک ہسپتال میں اِس قسم کی تربیت لیتا رہا مگر علمِ طب سے اُسے فطری طور پر چنداں رغبت نہیں تھی اور اس حقیقت کا اُسے شدّت سے احساس تھا کہ قدرت نے اُسے مذاقِ سخن دیا ہے اور اس کی جولانیٔ طبع کے لیے وہی میدان موزوں ہے۔ چناں چہ اُس نے علمِ طب کا مطالعہ منقطع کر دیا اور اپنے آپ کو شعر و سخن کے لیے وقف کر دیا۔ اُس کا پہلا مجموعۂ کلام "منظومات" ۱۸۱۷ء میں شائع ہُوا۔ جس میں "چیپ مین کے ہومر" والے سانٹ کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی نظم نہیں تھی جس کی خاص ادبی اہمیت ہو۔ ۱۸۱۸ء میں اُس کی ایک اور نظم "انڈیمیئن" شائع ہُوئی جس پر چند ادبی جرائد میں سخت نکتہ چینی ہوئی مگر کیٹس نے ہمت نہیں ہاری اور خاموشی سے مشقِ سخن جاری رکھی۔

اِن دِنوں کیٹس مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ اُدھر خرابیٔ صحت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس کا بھائی ٹام تپ دق کا شکار ہو گیا۔ کیٹس بہت افسردہ اور مغموم رہنے لگا۔ ۱۸۱۸ء میں ایک بُتِ کافر فینی براؤن کے عشق میں بُری طرح

گرفتار ہو گیا۔ ناکامیٔ عشق سے پریشانی میں مزید اضافہ ہوا اور دل کی دُنیا جو پہلے ہی سے ویران ہو چکی تھی اب تباہ ہُوا چاہتی تھی۔ اِس اثنا میں تپ دق جیسا نامُراد عارضہ اُسے لاحق ہو گیا اور صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے کلام کا آخری مجموعہ جس میں "لیمیا"، "اسابیلا"، "سینٹ اگنیز کی شب" اور "ہائی پیرین" جیسی غنائی نظموں کے علاوہ اور بھی کئی شہکار شامل ہیں ۱۸۲۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔

کیٹس کے دل میں قبل از وقت موت کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا کیوں کہ اُسے تپ دق ہو چکا تھا۔ اس خوف کا اُس نے اپنے مشہور سانٹ "ہراس" میں اظہار کیا ہے۔ ۱۸۲۰ء میں ڈاکٹری مشورہ پر وہ انگلستان چھوڑ کر اٹلی چلا گیا۔ ایک مخلص دوست اُس کے ساتھ تھا جو آخری دم تک اُس کی تیمارداری کرتا رہا۔ ۲۳ فروری ۱۸۲۱ء میں انگریزی ادب کا یہ بیش بہا ہیرا صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا۔ اُس کے مزار پر جو آج تک لاتعداد شعراء اور ادباء کی زیارت گاہ ہے کچھ اس طرح کے الفاظ کندہ ہیں ؎

لکھنا مرے مزار پہ اک بدنصیب تھا
جس کا شباب ہو گیا سرما کی چاندنی

کیٹس ۲۵ برس کی عمر میں مر گیا جب کہ اس کے فکر و نظر میں ابھی مکمل طور پر پختگی نہیں آئی تھی۔ اس کا تمام مطبوعہ کلام صرف تین سال میں یعنی ۱۸۱۷ء سے ۱۸۲۰ء کے دوران منظرِ عام پر آیا۔ تاہم اُس نے اس کم سنی میں بھی جو کچھ سپردِ قلم کیا اُسے پڑھ کر یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ اگر یہ ہونہار شاعر کچھ اور جیتا تو اغلباً شیکسپیئر کی بلندیوں کو چھو لیتا۔ سپنسر کی طرح اُسے "شمعِ سخن" کہنا بجا ہوگا۔ اُس کے کلام سے ٹینی سن۔ روزیٹی۔ مارس اور سون برن جیسے شعراء متاثر ہوئے اور استفادہ کیا۔

کیٹس رومانوی تحریک کا نہ صرف آخری بلکہ سب سے پختہ کار شاعر تھا۔

وہ نہ شیلے کی طرح ناقابل عمل اصلاحات کا محرک ہے نہ بائرن کی طرح زمانے بھر سے اُلجھنا چاہتا ہے۔ وہ شاعری میں واردات قلبی کی ترجمانی کرنے پر قانع ہے یا پھر حسنِ قدرت کی عکاسی کرتا ہے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ فلسفہ اور سیاست شاعری کے لیے مُضر ہیں۔ وہ ایک شاعرِ جمالیات ہے جو حُسن کی تصویر کھینچنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے اسے اکثر مصوّر شاعر کہا جاتا ہے۔ ایک مصوّر برش اور رنگوں کی مدد سے جس طرح تصویر کھینچتا ہے۔ کیٹس الفاظ سے وہی کام لیتا ہے۔ اُس کی بیشتر نظمیں ایک آئینہ خانہ ہیں۔ اُس کی حسّاس اور نازک طبیعت دُنیا کی تلخیوں کی تاب نہ لاکر تخیّل کی حسین دُنیا کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ افکارِ عالیہ اور واقعاتِ زندگی کی بھی کمی نہیں۔ تاہم کیٹس کی شاعری میں فرار کا رجحان غالب ہے۔ اُردو کے مشہور رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کی طرح وہ پرستارِ حُسن ہے۔ اگر شیلے اپنے کلام میں فلسفۂ عشق پیش کرتا ہے تو کیٹس حُسن کے بیان میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیتا ہے۔

لارڈ ٹینی سن

ولادت سنہ ۱۸۰۹ء - وفات سنہ ۱۸۹۲ء

الفرڈ ٹینی سن ۶ اگست سنہ ۱۸۰۹ء کو بمقام لنکن شائر پیدا ہوا۔ جارج کلیٹن ٹینی سن جو ایک پادری تھا ایک درجن بچوں کا باپ تھا اور الفرڈ ٹینی سن ان بارہ بچوں میں سے ایک تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں باپ سے حاصل کرنے کے بعد ٹینی سن ایک گرائمر سکول میں داخل ہوا مگر سکول کی زندگی کے اس کے تاثرات نہایت تلخ تھے۔ کیوں کہ اساتذہ کی تند طبیعت سے وہ نالاں تھا۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں وہ ٹرنٹی کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا جہاں وہ حلقۂ ارباب ذوق کا مرکز بن گیا اور سنہ ۱۸۲۹ء میں ایک آزاد نظم بعنوان "ٹمبکٹو" لکھ کر اس نے چانسلر کا تمغہ جیتا۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں بغیر ڈگری حاصل کیے اُس نے یونیورسٹی کو خیرباد کہا اور اس کے بعد چھ سال گوشۂ عافیت میں گذارے اس چھ سال کی خلوت نشینی کا ثمر سنہ ۱۸۳۲ء میں ایک حیرت انگیز مجموعۂ کلام بنام "منظومات" کی صُورت میں نمودار ہوا۔ اس مجموعہ میں "آرام طلب"۔ "قصرِ ہنر" "خوبصورت خواتین کا خواب" اور "شیلٹ کی صاحبزادی" جیسی دلآویز نظمیں شامل تھیں مگر ادبی نقادوں نے ٹینی سن کی نظموں کے اس مجموعے پر بڑی تُندی کے ساتھ حملے کیے۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں ٹینی سن کا ایک عزیز دوست آرتھر ہیلم رحلت کر گیا۔ ٹینی سن کو اس ناگہانی حادثے کا بے حد صدمہ پہنچا اور وہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُس نے ایک نظم بعنوان "یادگار" لکھنی شروع کر دی۔ نظم کا آغاز تو مرثیہ

کے طور پر ہُوا مگر رفتہ رفتہ اس مرثیے نے انگریزی ادب کی طویل ترین فلسفیانہ نظم کی صُورت اختیار کرلی۔

ہیلم کی موت کے دس سال بعد تک ٹینی سن منقار زیر پَر رہا۔ ۱۸۴۲ء میں احباب کے اصرار پر اُس نے اپنا دُوسرا مجموعۂ کلام چھپوایا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد ٹینی سن کی شہرت اور ہر دل عزیزی روز افزوں ہوتی گئی۔ اس مجموعہ میں "آرتھر کی موت"۔ "لاکسلی ہال" اور "دو آوازیں" جیسی حسین اور جمیل نظمیں تھیں۔ ۱۸۴۷ء میں "شہزادی" اور ۱۸۵۰ء "یادگار" کی اشاعت کے بعد ٹینی سن کی مقبولیت عروج پر پہنچ گئی اور اُس نے ملک کے ہر طبقے سے خراجِ تحسین پائی۔ ورڈز ورتھ کی وفات پر اُسے مَلِک الشعراء کا خطاب مل گیا۔ ۱۸۵۲ء میں "ڈیوک آف ولنگٹن کی موت پر" ایک نظم لکھی۔ اس کے بعد ہر برس وہ ایک نہ ایک شاندار نظم لکھ کر انگریزی ادب میں قابلِ قدر اضافہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اُسے ڈی سی ایل کی ڈگری سے سرفراز کیا اور ۱۸۶۹ء میں اُسے کیمبرج یونیورسٹی کی مجلسِ رفقا کا اعزازی رُکن منتخب کیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں گلیڈسٹون نے اُسے طبقۂ امراء میں شامل کرلیا۔ اس کے آٹھ سال بعد ۱۸۹۲ء میں یہ جلیل القدر شاعر ایک چاندنی رات میں اپنے اقربا اور احباب کو داغِ مفارقت دے گیا۔

عصرِ حاضر میں ٹینی سن کی شہرت زوال پذیر ہو چکی ہے۔ لیکن اپنے عہد کا وہ مقبول ترین شاعر تھا۔ اُس کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ نصف صدی تک اسے اپنے زمانے کا واحد نمائندہ اور مُلک کی آواز تسلیم کیا گیا اور اُس کی شاعری ساری ملّت کے عقائد و شبہات، افکار و جذبات اور امید و بیم کی ترجمانی کرتی رہی۔ ٹینی سن کا کلام ایک آئینہ ہے جو اپنے دَور کی سماجی۔ مُلکی۔ اخلاقی اور مذہبی صورتِ حالات کی عکّاسی کرتا ہے۔ ٹینی سن کے اشعار کا حیرت انگیز تنوّع اُن تمام خوبیوں کی یاد تازہ کرتا ہے جو انگریزی زبان کے بہترین شعرا کے ہاں موجود ہیں۔ سپینسر کی سی مجذوبیت کا بے خودانہ انداز، ملٹن کا

شان وشکوہ، ورڈز ورتھ کی سادگی، بلیک اور کولرج کی قوتِ واہمہ، کیٹس اور شیلے کی نغمگی، سکاٹ اور بائرن کا زورِ بیان۔ یہ تمام محاسن ٹینی سن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مگر ٹینی سن کی امتیازی خصوصیت نغمگی ہے اور اس کی غنائی شاعری اُس کے کلام کا بہترین حصہ ہے۔ آج کل ٹینی سن کو بہت بڑا مفکرؔ اور فلسفی تو نہیں مانا جاتا مگر اُس کے غنائی کلام کے مدّاحوں کی اب بھی کمی نہیں۔ جہاں تک فنّی استعداد کا تعلق ہے ٹینی سن کا جواب نہیں ملتا۔ اُسے ہیئت، بحور، اوزان اور زبان پہ مکمل عبور حاصل ہے۔ اُس کے حُسنِ بیان کا راز وہ ریاض اور احتیاط ہے جو وہ الفاظ کے انتخاب میں صرف کرتا ہے اور جب تک ایک شعر کاوشِ مسلسل کے بعد حُسنِ کامل کی تصویر نہیں بن جاتا اُسے ذہنی تسکین نہیں ہوتی اور اُس کی نفاست پسند طبیعت انتخاب در انتخاب کے قابلِ توصیف چکرؔ میں اُلجھی رہتی ہے۔ میرے خیال میں اگر حسنِ بندش کی تمثیلی وضاحت درکار ہو تو دوسرے تمام انگریزی شعراء کی نسبت ٹینی سن ہی کا کلام پیش کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

رابرٹ براؤننگ

ولادت ۱۸۱۲ء - وفات ۱۸۸۹ء

رابرٹ براؤننگ، مئی ۱۸۱۲ء کو بمقام کیمبرویل پیدا ہوا۔ اس کا والد جو کہ غیر معمولی قابلیت کا مالک تھا بینک آف انگلینڈ میں کلرک تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے پرائیویٹ سکول میں غیر تسلی بخش تجربہ کے بعد براؤننگ نے اپنی تعلیم گھر پر جاری رکھی بارہ سال کی عمر سے کچھ پہلے ہی اُس نے اشعار کا ایک مجموعہ لکھ ڈالا تھا مگر کوئی پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے اسے نذرِ آتش کر دیا۔ یونیورسٹی کالج لندن سے تعلیم پانے کے بعد وہ اٹلی چلا گیا اور وہاں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور لوگوں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ درحقیقت اس نے اپنا بہترین تخلیقی کام اٹلی کی خوشگوار فضاؤں میں کیا۔ اٹلی سے واپسی پر وہ الزبتھ بیرٹ کی نظموں میں دلچسپی لینے لگ گیا اور اس سے شناسائی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھتے گئے اور اس دوستی نے تاریخ ادب میں ایک رومانوی اور سنسنی خیز فسانے کی صورت اختیار کر لی۔ الزبتھ ناتواں تھی اور اس کے والد نے شادی کے لیے رضامندی نہ دی۔ لہٰذا ۱۲ ستمبر ۱۸۴۶ء کو براؤننگ الزبتھ کو لے کر بھاگ گیا۔ اُس وقت براؤننگ کی عمر چونتیس برس تھی اور الزبتھ اکتیس برس کی تھی۔ براؤننگ کا اپنے وقت کی مقبول ترین شاعرہ کے ساتھ فرار اُس کے لیے شہرت کا موجب ہُوا۔ براؤننگ نے الزبتھ کے ساتھ شادی کر لی اور وہ دونوں اٹلی چلے گئے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی پندرہ

خوشگوار بہاریں گذاریں۔ کبھی کبھار براؤننگ انگلینڈ بھی آجاتا۔ اس دور میں براؤننگ کا کلام شائع ہوتا رہا مگر اسے زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ مگر اس کا ایک مجموعۂ کلام "انگوٹھی اور کتاب" ۱۸۶۹ء میں منظرِ عام پر آتے ہی مقبولِ عام ہوگیا اور بالآخر اہلِ انگلستان نے انگریزی شعرا کی صفِ اول میں اُس کا مقام تسلیم کرلیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۹ء کو وہ راہیِ ملکِ بقا ہوا۔

رابرٹ براؤننگ ہر لحاظ سے ٹینی سن کا متضاد تھا۔ وہ وسیع المشرب تھا اور ٹینی سن والی تنگ نظری سے مطلقاً بالاتر۔ ٹینی سن کا اسلوب تحریر بھی آسان اور واضح ہے مگر براؤننگ کا اندازِ بیان سخت مشکل اور مبہم ہے۔ وہ اکثر پیچیدہ اور غیر معروف مضامین کو اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے۔ تھوڑے سے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیالات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے اور گرائمر کے قواعد کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ انہی وجوہات کے باعث اُسے اپنے زمانے میں جلد مقبولیت نصیب نہ ہوسکی۔

براؤننگ اُن شعرا میں سے نہیں ہے جو محض تفریحِ طبع کے لیے خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اس کا کلام سمجھنے کے لیے کافی کاوش اور یکسوئی درکار ہے لیکن اگر ہم یہ شرط قبول کرلیں تو اُس کے کلام سے لطف اندوز ہوکر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ یہ قیمت چنداں زیادہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی طرح وہ ایک بڑا مفکر اور فلسفی شاعر تھا۔ ذاتِ باری، عالمِ بالا اور حیاتِ جاودانی میں اعتقاد پر اُس کا سارا فلسفہ مبنی ہے۔ وہ رجائیت پسند ہے اور اُس کا یقینِ کامل ہے کہ ہماری ناکامیوں میں بھی ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ وہ ہمیں مسلسل جدوجہد اور سعی و عمل کی تلقین کرتا ہے۔ اور اس کا کلام ہمیں مشکلات کا مردانگی سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ براؤننگ کے اشعار پڑھ کر ہمیں زندگی کی صعوبتیں اور دشواریاں آسان، دلچسپ اور فائدہ مند نظر آنے لگتی ہیں اور دنیا کی بے آہنگیاں قابلِ قبول معلوم ہوتی ہیں۔ اُس کے نزدیک مایوسی گناہِ عظیم ہے۔

براؤننگ کا امتیازی طرّہ اُس کی عشقیہ شاعری ہے۔ اُس نے اپنی بیشمار غنائی اور تمثیلی (ڈرامائی) نظموں میں عاشقانہ جذبات اور خیالات کی تصویریں نہایت دلفریب انداز میں کھینچی ہیں فلسفیانہ اور نفسیاتی انداز نے ان نظموں کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ ہمارا جذبۂ صادق کبھی رائیگاں نہیں جاسکتا۔ محبّت میں ٹھکرائے جانے پر بھی اس کے کردار محبوبہ کو گالیاں نہیں دیتے اور نہ ہی اُنھیں شکوہ و شکایت کرنا آتا ہے بلکہ اُس کی رضا کے آگے سرِتسلیم خم کرنا ہی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ براؤننگ کے نزدیک محبّت ایک ایسی قوت ہے جس سے ہماری رُوح کو تقویت ملتی ہے۔

براؤننگ کے فن کی جدّت، تخیُّل کی رفعت، جذبات کی عفّت اور مضامین کی عظمت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ ایک نفسیاتی شاعر ہے اور فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں بے حد دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ انسان کے ارادوں، خواہشات اور جذبات کی تحلیل کرنے میں ماہر ہے۔ اُس کی نظم "ہم سفر" شاعر کی رجائیت پسندی، نفسیاتی مطالعہ اور فلسفۂ عشق کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

میتھیو آرنلڈ

ولادت ۱۸۲۲ء - وفات ۱۸۸۸ء

انگلستان کا مشہور ادبی نقاد، انشا پرداز اور شاعر میتھیو آرنلڈ ۱۸۲۲ء میں لیلیھم کے مقام پر پیدا ہُوا۔ اُس کا والد ڈاکٹر آرنلڈ رگبی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا میتھیو آرنلڈ نے ونچسٹر۔ رگبی اور آکسفورڈ سے تعلیم پائی۔ آکسفورڈ میں قیام کے دوران اُس نے سخنوری کے علاوہ یُونانی اور لاطینی زبانوں میں مہارت کے لیے انعامات حاصل کرکے اپنے آپ کو ممیز کیا۔ حصولِ تعلیم سے فراغت پانے پر آرنلڈ نے رگبی سکول میں ادبِ عالیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں اُسے اوریل کالج کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔ ۱۸۴۷ء میں وہ لارڈ لینز ڈاؤن کا پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہُوا اور اسی کی وساطت سے ۱۸۵۱ء میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدہ پر تعینات ہوا۔ اور پینتیس برس کے لیے اسی اسامی پر بڑی جانفشانی سے کام کرتا رہا۔ ۱۸۴۹ء میں اُس کا پہلا مجموعہ کلام "بھٹکا ہوا رند" شائع ہوا۔ تعجب کی بات ہے کہ اس کتاب کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال نہ ہُوا۔ تین سال کی خاموشی کے بعد اُس نے اپنا دُوسرا مجموعۂ کلام چھپوایا۔ اس کتاب کی اشاعت سے بھی آرنلڈ کی شہرت میں چنداں اضافہ نہ ہو سکا مگر اُس نے ہمّت نہ ہاری اور مشقِ سخن جاری رکھی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۷ء تک دس سال کے عرصہ کے لیے وہ آکسفورڈ

یونیورسٹی میں شاعری کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس کے بعد آرنلڈ نے شعر گوئی چھوڑ کر نثر میں تنقید نگاری شروع کر دی۔ اس کے تنقیدی مضامین کی دو جلدوں کی اشاعت کے بعد آرنلڈ کا شمار عہد کے بہترین ادبی نقادوں میں ہونے لگا۔ آرنلڈ کی تصانیف نے اس عہد پر گہرا اثر ڈالا۔ ۱۸۸۸ء میں جب اُس کی شہرت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ وہ ناگاہ عالمِ فانی سے عالمِ بقا کو چل دیا۔

آرنلڈ عہدِ تغیر کا شاعر تھا۔ وہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء کے دوران شاعری کرتا رہا جب کہ دیرینہ نظریات کو ضرب کاری لگ رہی تھی۔ فرانسیسی انقلاب، ڈارون کا نظریہ اور آکسفورڈ کی تحریک جیسے اہم واقعات نے پُرانی قدروں کو بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اضطراب اور افسردگی بھر گئی تھی۔ حُزنیت کی لہر سارے انگلستان پر چھا چکی تھی۔ اس صورتِ حالات نے آرنلڈ کے حسّاس ذہن میں بھی ایک گمبھیر یاسیت بھر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا بیشتر کلام افسردگی اور حُزنیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنے عہد کی مادّیت۔ اعتقاد کے فقدان اور شکوک و شبہات پر قلم اٹھاتے وقت اُس کی طبیعت زوروں پر نظر آتی ہے۔

حُزنیت پسندی کے باعث آرنلڈ کی طبیعت نوحہ خوانی کے لیے خصوصاً موزوں ہے۔ لہٰذا نوحہ یا مرثیہ لکھنے والے شعرا میں آرنلڈ کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے اس خاص صنفِ سخن کو آرنلڈ نے معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ میر انیس کی طرح آرنلڈ کے مرثیوں میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ خیالات کی متانت، بیان کی سنجیدگی، تشبیہات کی موزونیت، پُرحسرت لہجہ اور لطیف چاشنی آرنلڈ کے کلام کی قابلِ ذکر خوبیاں ہیں۔ بلاشبہ آرنلڈ کے کلام میں وہ حرارت اور شدّتِ جذبات مفقود ہے جس کے باعث اُس کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں ہو سکے تاہم متفکرانہ قسم کی شاعری کے باعث آرنلڈ کا تاریخِ ادب میں مخصوص اور محفوظ مقام ہے۔

سروجنی نیڈو

ولادت ۱۸۷۹ء - وفات ۱۹۴۹ء

سروجنی نیڈو ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئی۔ اس کا والد اگھور ناتھ چٹوپادھیا ایک سرکردہ سائنس دان اور عالم تھا۔ اس طرح سروجنی کی تربیت سازگار ماحول میں ہوئی اور چھوٹی عمر میں ہی اُس نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ بارہ برس کی عُمر میں اُس نے میٹرک کا امتحان مدراس یونیورسٹی سے پاس کیا بعدازاں ڈاکٹر نائیڈو سے محبّت ہوگئی۔ ۱۸۹۵ء میں نظام کی جانب سے وظیفہ ملنے پہ وہ انگلستان چلی گئی اور وہاں لندن اور کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگلستان میں قیام کے دَوران اُسے ایک بار اٹلی کی دلآویز سرزمین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں کے دِل کش مناظرِ قدرت کا اس کی حسّاس رُوح پہ گہرا اثر ہُوا۔ ۱۸۹۸ء میں خرابیٔ صحت کے باعث وہ ہندوستان واپس آگئی۔ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر نائیڈو کے ساتھ اُس کا بیاہ ہوگیا اور اُس کی ازدواجی زندگی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔

مسز سروجنی نیڈو کی رُوح میں شاعری کے علاوہ حب الوطنی کا مادّہ بھی کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔ اُس نے جنگ آزادی میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا اور انڈین نیشنل کانگرس کی ایک سرکردہ کارکُن بن گئی۔ سروجنی نیڈو پہلی خاتون تھی جو کانگرس کی صدر بنی۔ اُس کے

قلم اور زبان دونوں میں جادو تھا۔ اور لاکھوں ہندوستانی خواتین نے اُس سے فیضان حاصل کیا۔ مُلک کے آزاد ہو جانے پر وہ اُتر پردیش کی گورنر مُقرّر ہوئی اور سنہ ۱۹۴۹ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔

مسز سروجنی نیڈو نے اپنی شاعری کا آغاز اہلِ انگلستان کی زندگی بیان کرنے سے کیا۔

مسٹر ایڈمنڈ گاس نے جو ایک مشہُور انگریزی شاعر اور نقّاد تھا سروجنی کو مشورہ دیا کہ انگریزی شاعری کی تقلید کی بجائے اُس کو ہندوستانی زندگی کی عکاسی کرنی چاہیئے۔ اور اس کی شاعری انگریزی قارئین کے لیے ہندوستانی موضوعات کی تفسیر ہونی چاہیئے۔ مسز سروجنی نیڈو نے یہ معقول اور مخلصانہ مشورہ قبول کرلیا۔ چُناں چہ اُس نے "وقت کا پنچھی"، "سُنہری دہلیز" اور "شکستہ پر" جیسے اشعار کے مجموعوں میں ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کھینچی ہے منظر کشی میں اُسے خاص مہارت حاصل ہے، اور اس کی شاعری ہندوستان کی شہری اور دیہاتی زندگی کی زندہ تصویر ہے۔ ہندُستان کے تہوار، رسوم و رواج، عقائد اور روایات، گلہائے رنگا رنگ، بازار، سپیرے، فقیر اور مُطرب اُس کے پسندیدہ موضوعاتِ سخن ہیں۔

سروجنی کا ذوق فطرۃً غنائیہ ہے اور اُس کی شاعری ترنّم سے بھرپور ہے۔ اُس کے ہر شعر سے رومانیت ٹپک رہی ہے اور اُس کا عشقیہ کلام شدّتِ جذبات سے معمُور ہے۔

سروجنی نائیڈو کا کلام صاف اور سلیس ہونے کے باوجود اُس کی کئی نظموں کا انداز فلسفیانہ ہے "کنول پہ بیٹھا ہوا مہاتما بدھ" اس قسم کی بہترین فلسفیانہ نظم ہے۔ یہ متصوّفانہ عنصر اُس کی نظم "تنہائی"

میں بھی موجود ہے۔
مسز سروجنی نائیڈو کو اُن کی خوش بیانی کے سبب "بلبل ہند"
کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔